فریضۂ اقامت دین

مولانا صدر الدین اصلاحی

فہرست مضامین

باب اول

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

انسانی زندگی کا بنیادی شرف یہ ہے کہ وہ ایک بامقصد زندگی ہو۔ بے مقصد زندگی بسر کرنے والا انسان دراصل بے انسانیت کا انسان ہے۔ "مسلمان" اس انسان کا نام ہے، جو صرف بامقصد ہی نہیں بل کہ صحیح مقصد والی زندگی گزارتا ہے۔ اس لیے ایک شخص اگر مسلمان ہے تو یہ اس کا سب سے بڑا اور سب سے مقدم فریضہ ہے کہ وہ اپنے مقصدِ حیات سے بخوبی واقف ہو، اسے ہمیشہ اپنی نظروں میں رکھے اور اپنی پوری عملی زندگی اسی مرکز کے گرد گھماتا رہے۔

اس کتاب کی غرض و غایت یہی ہے۔ اس کے اسی اہم ترین مسئلے کی طرف وابستگانِ اسلام کو پوری شدت سے متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ غرض پوری ہو۔ جو باتیں اس کتاب میں حق کے مطابق ہوں وہ دلوں میں جگہ پائیں اور اگر کچھ باتیں ایسی نہ ہوں تو ان کے اثر سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

زیرِ نظر کتاب —فریضۂ اقامت دین— اس سے پہلے دو بار شائع ہو چکی ہے۔ مگر دونوں بار ایسے حالات میں شائع ہوئی کہ راقم الحروف کو مسودے پر نظر ثانی کرنے اور اس کی ترتیب و تدوین کا ازسرِ نو غور کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس لیے جب

بھی وہ شائع ہوئی ناقص انداز ہی میں شائع ہوئی۔ اب کی بار اللہ تعالیٰ نے اس بات کا موقع عنایت فرمایا تو پچھلی اشاعتوں کے مقابلے میں بحمد اللہ کافی مختلف حالت میں شائع ہو رہی ہے۔ زبان بھی قدرے آسان کر دی گئی ہے، بعض ضروری مباحث بھی بڑھا دیئے گئے ہیں اور بعض غیر ضروری چیزیں حذف بھی کر دی گئی ہیں اور مباحث کی ترتیب کو بھی بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس طرح اس کی افادیت ضرور بڑھ گئی ہو گی۔

صدر الدین
۱۸/رجب المرجب ۱۳۷۷ھ

پہلا باب

امت مسلمہ کا مقصد وجود

امت کی امتیازی حیثیت

امت مسلمہ جس وقت وجود میں لائی جارہی تھی اس کے لانے والے نے اس کے بارے میں فرمایا تھا :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران:۱۱۰)

"تم ایک بہترین امت ہو جو سب انسانوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔"

یہ کلمات دو اجزا پر مشتمل ہیں :-

(۱) مسلمانوں کی جماعت تمام انسانی جماعتوں میں سب سے اچھی جماعت ہو گی۔ دوسری کوئی جماعت، کوئی قوم، کوئی پارٹی فکر اور عمل کی خوبیوں میں اس جیسی نہ ہو گی۔ (كنتم خير أمة)۔

(۲) یہ جماعت، یہ امت مسلمہ، دنیا کی عام جماعتوں، قوموں اور گروہوں کی طرح زندگی کے اسٹیج پر معمول کے مطابق یوں ہی نہیں آنکلی ہے بل کہ ایک خاص اہتمام سے نکال کر لائی گئی ہے۔ اس کے لائے جانے کے پیچھے ایک خاص مقصد کام کر رہا ہے۔ دنیا کے دوسرے تمام گروہوں کے اور اس کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ کہ یہ انہی میں سے ایک نہیں ہے۔ بل کہ ان سب سے الگ اور ممتاز ہے اور ان کی کسی خاص ضرورت کے لیے اسے وجود بخشا گیا اور اہتمام کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ اور اب وہ ہمیشہ کے لیے اسی کی بجا آوری پر مامور ہے۔ (أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی اس امت کو صریح لفظوں میں "مبعوث" یعنی بھیجی اور مامور کی ہوئی امت قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً

فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ (بخاری جلد دوم)

"تم نرمی سے کام لینے والے بنا کر بھیجے گئے ہو تنگیوں میں ڈالنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔"

اللہ اور رسول کے ان ارشادات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ دوسری تمام امتیں اور قومیں ایک سطح پر ہیں اور امت مسلمہ ایک دوسری سطح پر ہے۔ وہ ایک جداگانہ نوعیت کی مالک اور ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ جب اس کی نوعیت اور حیثیت دوسری تمام قوموں سے مختلف اور ممتاز ہے تو اس سے آپ سے آپ یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ اپنے طرزِ فکر میں، اپنے طریقِ عمل میں، اپنی دل چسپیوں میں، اپنی قدروں میں، اپنی پسند و ناپسند کے معیاروں میں، اپنے مزاج میں، اپنے مقصد و نصب العین میں، غرض ایک ایک پہلو سے وہ اپنا الگ اور مخصوص مقام رکھتی ہے۔ اور اس کے کسی معاملے کو دوسری کسی قوم یا جماعت پر ہرگز نہیں قیاس کیا جا سکتا۔

مقصد وجود (اقامت دین)

اس وضاحت سے اتنی بات تو متعین طور سے معلوم ہو جاتی ہے کہ اس امت کے وجود کا کوئی خاص اور ممتاز مقصد ہے۔ اب دریافت طلب بات یہ رہ جاتی ہے کہ اس کے وجود کا یہ خاص اور ممتاز مقصد کیا ہے؟ قرآن مجید نے مذکورہ بالا الفاظ فرمانے کے معاً بعد ہی اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے:۔

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

”تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

یعنی وہ خاص کام جس کے لیے مسلمانوں کا یہ گروہ برپا کیا گیا ہے۔ یہ ہے کہ وہ پوری نوعِ انسانی کو غلط فکریوں اور غلط کاریوں سے روک کر صحیح راہ پر لائے۔

اس خاص کام یا خاص مقصد کے بیان کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو اور تعبیریں اختیار فرمائی ہیں۔ ان میں سے پہلی تعبیر ”شہادت حق“ کی ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ.

(البقرۃ:۱۴۳)

”اور اسی طرح ہم نے (اے مسلمانو!) تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے۔ تاکہ تم دوسرے تمام انسانوں کے لیے گواہ بنو۔“

اس مفہوم کی اور انہی جیسے لفظوں میں ایک آیت سورۂ حج میں بھی موجود ہے، اور اگرچہ ان میں سے کسی آیت کے اندر بھی اس چیز کی صراحت نہیں کی گئی ہے جس کی گواہی (شہادت) دینے کے لیے یہ امت مبعوث کی گئی ہے۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بجائے خود بالکل

صریح تھی۔ ظاہر ہے کہ جو شئے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جارہی تھی، اس کے سوا اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جس کی اہل دنیا کے سامنے شہادت دینے کا اسے ذمہ دار بنایا جاتا؟ اس کا ثبوت خود انہی آیتوں کے ان لفظوں میں بھی موجود ہے جو مذکورہ لفظوں کے بعد لائے گئے ہیں اور جن میں فرمایا گیا ہے کہ "اور پیغمبر تمہارے لیے گواہ ہو وَيَكُونَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا" غور کیجئے وہ کیا چیز تھی جس کی اہل ایمان کے سامنے گواہی دینے کے لیے اللہ کا رسولؐ بھیجا گیا تھا؟ اگر یہ چیز صرف وہ دین حق تھی جو اس پر نازل ہو رہا تھا اور اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، جیسا کہ واقعہ ہے تو اس میں بھی دو رائیں ممکن نہیں کہ جس چیز کی گواہی دینے کے لیے "امتِ وسط" کو قائم کیا گیا تھا وہ بھی یہی دین حق تھا جسے چاہے آپ "دین حق" کہہ لیجئے، چاہے صرف حق۔

دوسری تعبیر "اقامت دین" کی ہے :۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ. (الشوری: ۱۳)

"(مسلمانو) اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جس کی (اے نبیؐ) ہم نے تم پر وحی کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ کو موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو دیا تھا کہ اس دین کو قائم کرو۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ صحابہ کرام کا مقام و مرتبہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ. (مشکوٰۃ)

"انہیں اللہ نے اپنے نبیؐ کی معیت اور اپنے دین کی اقامت کے لیے پسند فرمایا تھا۔"

یہ حدیث بھی اس امر کو ایک امر واقعہ بتاتی ہے کہ اس امت کی غایتِ وجود اللہ کے دین کی اقامت تھی۔

قرآن اور حدیث کے ان تینوں بیانات کی بنا پر امت مسلمہ کے مقصد وجود کے لیے آپ جس تعبیر کو چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس امت کا مقصد وجود "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہے، یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "شہادت حق" ہے، اور یہ بھی کہ "اقامتِ دین" ہے۔ کیونکہ یہ تینوں ایک ہی مدعا کی مختلف تعبیریں ہیں۔ اور ان میں سے جس کو بھی آپ استعمال کریں گے معنی و مقصود ہر حال میں ایک ہی ہو گا۔

لیکن معنی و مقصود کی اس یکسانی کے باوجود اگر آپ ان تینوں تعبیرات کا گہری نظر سے جائزہ لے کر ان کا ہر پہلو سے موازنہ کریں گے تو پائیں گے کہ آخری تعبیر میں جو جامعیت جو ہمہ گیری اور جو صراحت ہے وہ دوسری تعبیروں میں نہیں ہے۔

زیادہ جامعیت اس طرح ہے کہ اس میں اقامت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اقامت کا لفظ جیسا کہ آگے چل کر وضاحت سے معلوم ہوگا ایک مکمل کیفیت کا تصور پیش کرتا ہے۔

زیادہ ہمہ گیری یوں ہے کہ متعلقہ آیت میں صرف اتنا ہی نہیں فرمایا گیا ہے کہ فلاں شے مسلمانوں کا فریضۂ حیات ہے، بل کہ یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ یہی فریضہ ہر نبیؑ کا اور اس کے ساتھیوں کا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ پر ایمان لانے اور اس کی بندگی کا عہد کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کے دین کی اقامت کی جائے۔

زیادہ صراحت اس طرح ہے کہ اس چیز کا ذکر جس کی اقامت اہل ایمان کو کرنی ہے متعلقہ آیت میں بالتصریح موجود ہے اور نام لے کر فرما دیا گیا ہے کہ یہ چیز "الدین" یعنی اللہ تعالےٰ کا بھیجا ہوا دین ہے۔

ان خصوصیتوں کی بنا پر "اقامت دین" کی تعبیر کو غالب اصطلاح ہونے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لیے امت مسلمہ کا مقصد وجود ظاہر کرنے کے لیے اسی کا استعمال زیادہ مناسب رہے گا۔

اقامت دین کا مفہوم

"اقامت دین" کی اصطلاح دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک "اقامت" دوسرا "دین"۔ اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان دونوں لفظوں کے الگ الگ معنی سمجھ لیے جائیں۔

اقامت کا لفظ جب کسی ٹھوس چیز کے لیے بولا جائے تو اس وقت اس کے معنے 'سیدھا کر دینے کے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:۔

يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ (الکہف:۷۷)

"دیوار (ایک طرف کو جھک گئی تھی) اور گرا چاہتی تھی تو اس نے اسے سیدھا کر دیا۔"

اور جب وہ کسی ٹھوس چیز کے بجائے معنوی اشیاء کے لیے بولا جاتا ہے تو اس وقت اس کا مفہوم پورا پورا حق ادا کر دینے کا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ متعلقہ کام کو پوری توجہ اور کامل اہتمام کے ساتھ بہترین شکل میں انجام دے دیا جائے۔ امام اللغتہ علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں:۔

اقامة الشیٔ توفية حقه وقال قل یااھل الکتاب لستم علیٰ شیٔ حتی تقیموا التوراة والانجیل ای توفون حقوقھا بالعلم والعمل.

(المفردات)

”کسی چیز کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حقوق اچھی طرح پورے کردیئے جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”اے پیغمبر کہہ دو اے اہلِ کتاب تم کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرلو“ یعنی جب تک کہ علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے ان کے حقوق ادا نہ کردو۔“

اس مفہوم کو ایک مثال سے سمجھئے، قرآن میں نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے ”اقامت“ کے اس مفہوم کی رو سے نماز کی اقامت یہ ہوگی کہ اسے اس کے تمام ظاہری آداب و شرائط اور سارے باطنی محاسن کے ساتھ ادا کیا جاتا رہے، اس طرح کہ نماز کا جو مقصد ہے وہ بحسن و خوبی حاصل ہوتا رہے۔ لہٰذا دین کی اقامت یہ ہوئی کہ اس کے ماننے والے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس کے ماننے کا حق ادا کردیں۔

”دین“ کے لغوی معنی اطاعت کے ہیں۔ اور اصطلاحاً اس سے مراد اللہ کی بندگی کا وہ طریقہ اور انسانی زندگی کا وہ نظام ہے جو اللہ تعالیٰ کی جناب سے پیغمبر کے ذریعہ اس کے بندوں کو عمل درآمد کے لیے دیا گیا ہے، اور جس کی تفصیلات اس کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں موجود ہیں۔ ان تفصیلات کے دیکھنے سے اس بات میں کسی شک کی گنجائش مطلق نہیں رہ جاتی کہ انسانیت کا کوئی مسئلہ اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس کے دائرے میں نہ آگیا ہو۔ یہ دین انسان کی عقل و فہم اور اس کے دل کی گہرائیوں سے شروع ہو کر اس کی عبادت گاہوں، اس کے گھر کی چار دیواریوں، اس کے خاندانی حلقوں، اس کے تمدنی اداروں سے ہوتا ہوا اس کے تمام اجتماعی اور بین الاقوامی مسئلوں کے آخری کنارے تک پہونچتا ہے اور ہر مسئلے، ہر معاملے اور ہر شعبے کے متعلق اپنی مستقل ہدایات دیتا ہے وہ انسان کی کسی ایسی نجی اور پرائیوٹ زندگی کا بالکل قائل نہیں جس میں وہ اپنی سی کرنے میں آزاد ہو۔ وہ انسانی زندگی کے لیے کسی ایسی ”دنیا“ کا وجود تسلیم کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں جہاں وہ خود موجود نہ ہو۔ وہ ایمانیات کو، عقائد کو، عبادات کو، اخلاق کو، تقویٰ اور احسان کو تو اپنے اجزا کہتا ہی ہے، بیت الخلاء کے آداب اور ازدواجی تعلقات جیسی چیزوں کو بھی اپنے سے بے تعلق نہیں قرار دیتا، اور مجرموں پر سزا کے نفاذ کو بھی ”اللہ کا دین“ ہی کہتا ہے۔ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ۔ (النور:۲)

"اقامت" اور "دین" کے ان مفہوموں کو سامنے رکھیے۔ اقامت دین کا مفہوم خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ جب اقامت کے معنی علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے پورا پورا حق ادا کرنے کے ہیں اور دین کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی ایسی کامل اطاعت ہے جس سے زندگی کا کوئی ایک گوشہ بھی بے تعلق نہیں اور جس کے مطالبے وہاں ختم ہوتے ہیں جہاں انسانیت کے مسائل کی آخری حد آجاتی ہے تو اقامتِ دین کا مفہوم لازماً یہی ہوگا، اور صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس دین پر ایمان رکھنے والے اس سے پوری طرح واقف ہوں، اس کے بنیادی تصورات سے، اس کے اصول سے، اس کے احکام وہدایات سے باخبر ہوں، اس کے مقصد ومنشاء کو جانتے ہوں۔ انہیں یہ معلوم ہو کہ وہ اس دنیا میں ان کی کیا پوزیشن ٹھہراتا ہے؟ ان کے وجود کی کیا غایت مقرر کرتا ہے؟ اس غایت تک پہونچنے کے لیے سعی وعمل کی راہیں کیا تجویز کرتا ہے؟ انہیں کن کن باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور کن باتوں سے روکتا ہے؟ زندگی کے مختلف شعبوں میں انہیں کیا رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے؟ غرض بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت وہ ان سے اس زمین پر کس طرح رہنے، کیا کرنے، اور کیا بننے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ جانتے ہوں اور پھر اس جاننے کے مطابق اپنے عمل کو ڈھال لینے میں لگ جائیں۔ قرآن اور سنت کی ایک ایک ہدایت پر عمل ہو، شریعت کا ایک ایک حکم نافذ ہو، دین کے جتنے اصول ہوں ان سب پر اور صرف ان ہی پر حیات ملی کی عمارت بنائی جائے۔ کوئی بھی معاملہ ہو، نقطۂ نظر صرف وہ اختیار کیا جائے جو یہ دین سکھاتا ہے اور پوری سوسائٹی پر رنگ وہ چھا جائے جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کو پورا ماحول قرآنی اور پورا معاشرہ ایک متحرک قرآن نظر آنے لگے یعنی جس طرح کوئی بلند قامت شئے سیدھی کھڑی کردی جاتی ہے تو دیکھنے والے بیک نگاہ دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کیا ہے اور کیسی ہے؟ اسی طرح یہ پورا دین انسانی زندگی پر اس طرح غالب اور نافذ ہو جائے کہ وہ دور دور سے "دیکھ" اور "پہچان" لیا جائے۔

دوسرا باب

مقصد فراموشی اور اس کے نتائج

اصول و مقصد کی اہمیت

کسی خاص اور اہم مقصد کی علمبردار جماعت کی زندگی اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی نگاہ اپنے مقصد اور نصب العین پر اچھی طرح جمی رہے اور مقصد و نصب العین پر نگاہ کا جمار ہنا اس بات پر موقوف ہے کہ اس مقصد تک پہونچنے کے جو اصول ہیں انہیں یہ جماعت دل و جان سے عزیز رکھتی ہو۔ اگر اس کے افراد میں اپنے مقصد کا گہرا عشق اور اپنے اصول کا گہرا یقین موجود ہو تو موت اس کو آنکھیں نہیں دکھا سکتی۔ یہ عشق و یقین اس بات کی ضمانت ہے کہ اس جماعت سے عزت و اقبال منہ نہیں موڑ سکتے۔ اور پھر اسی عشق و یقین کا یہ لازمی اور فطری تقاضا ہے کہ جماعت کا اجتماعی نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی ایسا اجتماعی نظم اس پر مسلط ہو جو اس کے محبوب اصولوں پر تعمیر نہ کیا گیا ہو اور اگر سوء اتفاق سے اس پر کبھی ایسے دن آ ہی پڑے تو اسکا ایک ایک فرد اس مچھلی کی طرح بے قرار ہو رہے گا جس کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو، اور اپنے مقصد اپنے اصول اور اپنے نظام حیات کی محبت اسے موت کی بازی کھیلنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ رائج الوقت نظام کے خلاف سراپا اضطراب بن جائے گا، اور اس کے ساتھ کسی قسم کے اختیاری تعاون یا مداہنت کا تصور تک اس کے لیے نا قابل برداشت ہو گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہو گا کہ میری انفرادی اور جماعتی زندگی کا تشخص جن اصولوں سے قائم ہے ان کا اسی نظام قاہر نے گلا گھونٹ رکھا ہے۔ یہ اضطراب، سکون سے اسی وقت بدل سکے گا جب کہ وہ اس نظام غیر کی دھجیاں بکھیر چکا ہو گا۔

اس کے بخلاف اگر کسی جماعت کے اندر اپنے اصولوں کا یقین مرجھا گیا اور اپنے مقصد و نصب العین کا عشق بے جان ہو گیا ہو تو یہ اس کے مٹ جانے کی نا قابل انکار علامت ہے۔ اس کم

یقینی اور سرد مہری کے نتیجے میں اگر اس کے اندر کسی دوسرے نظام کے ساتھ تعاون اور مداہنت کا رجحان ابھر آئے تو اس پر ہرگز کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے۔ اور کسی ایسے رجحان کا اُبھر آنا اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ حیات ملی کے محافظوں نے خزانہ کی کنجیاں دشمنوں کے حوالہ کر دیں، اور اب اس پونجی کا لٹ جانا بس کوئی دن کی بات ہے جسے کوئی معجزہ ہی روک سکتا ہو تو روک سکے۔ پھر چوں کہ زوال ہو یا کمال اس دنیا میں کسی کی فطرت میں ٹھہراؤ نہیں ہے، اس لیے اس کے یقین وعشق میں اس زوال کا عمل اپنی رفتار سے برابر آگے بڑھتا جاتا ہے اور آخر کار ایک مقام پر پہونچ کر وہ اس لٹی ہوئی پونجی کے لٹ جانے کے احساس کو بھی لوٹ لیتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب افراد جماعت میں کسی دوسرے اصول و نظام زندگی کی غلامی کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے، جب وہ تعاون اور مداہنت کی بھی حدیں پھاند چکے ہوتے ہیں، جب انہیں اپنا اصولی اور اخلاقی موقف ہی نہیں یاد رہ جاتا، جب وہ اپنے مقصد اور اصول سے اتنے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ ان کا عملی رویہ تو ان چیزوں کے غلط اور ناقابل قبول ہونے کی گواہی دینے ہی لگتا ہے ان کو نظری طور پر بھی یہ گوارا نہیں رہ جاتا کہ معاشرے اور مملکت کی باگ ڈور پھر سے ان اصولوں کے ہاتھ میں دے دیئے جانے کی کوئی جدوجہد کی جائے اور اگر کسی گوشے سے اس طرح کی کوئی پکار بلند ہو جاتی ہے تو وہ اسے حیرت کے کانوں سے سنتے اور اختلاف وعناد کی زبانوں سے اس کا جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر جماعت بحیثیت ایک اصولی جماعت ہونے کے فنا ہو جاتی ہے اور اس کے نالائق فرزند اپنے ہی ہاتھوں اسے قبر کی گہرائیوں میں سلا دیتے ہیں۔

ان دونوں موخرالذکر صورتوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جماعت مادی حیثیت سے بھی بے نام ونمود ہو جائے اور دنیا کی دولت اور سیاست میں اس کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہ جائے۔ اس کے برعکس یہ عین ممکن ہے کہ عام مادی تدبیروں پر عمل کر کے وہ اقوام عالم کی صفوں میں ایک نمایاں اور عظیم الشان پوزیشن کی مالک ہو جائے، اس کے پاس حکومت کا کروفر ہو، دولت کی شان وشوکت ہو، قومی اقتدار اور بین الاقوامی وقار ہو۔ لیکن اپنی ان تمام شوکتوں اور عظمتوں کے باوجود اس مقصد اور ان اصولوں کے نقطۂ نظر سے جن پر اس جماعت کی بنیاد قائم تھی، اس کا وجود وعدم برابر ہوگا۔ جن اصولوں کی لاش ان کے پیروں تلے روندی جا رہی ہو ان کو اس سے کیا بحث کہ وہ ذلت کی خاک پر ہے یا عظمت کے آسمان پر۔ ان کو اگر بحث ہے تو صرف اس بات سے کہ زندگی کے میدان میں ہم کو غالب وکارفرما بنانے کی اس کے افراد کے دلوں میں کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس

کے لیے اپنی جان، اپنے مال، اپنے ذرائع اور اپنی قوتوں کی کتنی قربانیاں دے رہے ہیں؟ لیکن اگر یہ کچھ نہیں ہے تو اپنی زبان حال سے یہ اصول ان سے اپنی بےتعلقی کا اعلان کردیں گے۔ اور پھر انصاف و دیانت کا کھلا تقاضا ہوگا یہ لوگ بھی اپنی طرف سے اس اعلان کے برحق ہونے کی تصدیق کردیں۔ اب ان کے لیے یہ کسی طرح بھی جائز نہیں رہ جاتا کہ وہ ان اصولوں کا نام بدستور اب بھی لیتے جائیں اور اپنے آپ کو اس جماعتی لقب سے موسوم کرتے رہیں جو کبھی ان اصولوں کی صحیح نمائندگی کے سبب ہی انہیں ملا تھا۔

اصول اسلام کی شرکت بیزاری

اس اصولی حقیقت کا اطلاق دنیا کی ہر جماعت پر ہوتا ہے۔ امت مسلمہ بھی اس کلیہ سے کسی طرح مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ اس کی بھی اپنی واقعی زندگی کا دارومدار، اول و آخر، اپنے اصل مقصد وجود اور اپنے اصول حیات ہی پر ہے۔ اس کے لیے بھی اپنے اصولوں کی اہمیت ویسی ہی ہے جیسی کہ کسی اور جماعت کے لیے اس کے اصولوں کی ہوسکتی ہے، بل کہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ کیونکہ زندگی کے دوسرے مسلکوں کے مقابلہ میں اسلامی مسلک حیات کی ایک ممتاز نوعیت ہے۔ وہ ایک ایسی خصوصیت کا حامل ہے جو کسی اور مسلک (ازم) اور نظام میں نہیں پائی جاتی۔ دنیا میں اسلام کے علاوہ دوسرے جتنے بھی نظام پیش کیے گئے ہیں وہ سب انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار ہیں۔ اس لیے مزید غور و فکر اور نئے تجربات اور معلومات کی روشنی میں ان کے اندر ترمیم کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ حتیٰ کہ ضرورت جب مجبور کردیتی ہے تو ان میں کتنے ہی بیرونی اصولوں کا پیوند بھی لگالیا جاتا ہے جس پر ان کے مخلص سے مخلص اور پرجوش سے پرجوش عقیدت مندوں کو بھی عموماً کسی احتجاج کا خیال تک نہیں آتا۔ لیکن اسلام کا معاملہ اس باب میں بالکل دوسرا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میرا پیش کیا ہوا مسلک حیات اور میرے اصول کسی انسانی دماغ کا نتیجہ نہیں ہیں، بل کہ یہ اس علیم و خبیر کے تجویز فرمائے ہوئے ہیں جو نوع انسانی کے فطری تقاضوں، اس کی انفرادی اور اجتماعی مصلحتوں اور اس کی تمام داخلی اور خارجی ضرورتوں کا صحیح اندازہ داں ہے، اور جس کی نگاہ سے انسانی سرشت کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہیں۔ اس لیے یہ مسلک کامل عدل اور توازن کا مسلک ہے، فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔ عالمگیر اور جہانی ہے۔ وقت اور جگہ کی حدبندیوں سے آزاد اور کسی ترمیم کی ضرورت سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہے۔ بشری علوم و افکار اور نئے سے نئے تجربات اور معلومات اس کی کسی ایک اصل پر بھی کبھی انگلی نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے اگر کسی نے اس کی

پیروی کا دعوی رکھتے ہوئے بھی ایسی کوئی جسارت کرنی چاہی تو اس کا شمار اس کے باغیوں میں ہوگا، نہ کہ فرماں برداروں میں۔

کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کا یہ رویہ بہت سخت اور سرتاسر آمرانہ ہے۔ لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو یا تو اسلام کے اس دعوے ہی کا منکر ہو کہ وہ ایک خداوندی مسلک حیات ہے، یا پھر وہ حقیقت اور گمان میں فرق ہی کرنا نہ جانتا ہو اور علم الٰہی کو علم انسانی پر قیاس کرتا ہو۔ ورنہ اس سے بڑا عقلی دیوالیہ پن اور کیا ہوگا کہ ایک شخص یہ بھی کہتا ہو کہ اسلام کے پیش کیے ہوئے اصول کا سرچشمہ علم الٰہی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہو کہ یہ اصول قابلِ ترمیم بھی ہو سکتے ہیں۔ اس مسلکِ حیات کا کٹر سے کٹر مخالف بھی ازروئے انصاف کسی کو یہ حقِ آزادی نہیں دے سکتا کہ ایک طرف تو وہ اسلام کی عقیدت کا دم بھرے، دوسری طرف اس کے اصولوں پر عمل جراحی بھی کرتا پھرے۔ ہاں اس کو یہ آزادی ہر وقت حاصل ہے کہ وہ سرے سے اسلام ہی کو چھوڑ دے، اگر اس کے پورے دعوے کی پوری سچائی میں اسے تردد ہو اور اس کے نزدیک اس کے اصول ترمیم و اصلاح کے محتاج ہوں۔

اس فرق کو ذہن نشیں کر لینے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر کسی اور جماعت کے لیے اپنے مسلک کے مخالف اصولوں اور مسلکوں سے تعاون یا مصالحت کرنا ممکن ہو تو ہو مگر اسلام کے نام پر بننے والی جماعت کے لیے تو کسی غیر اسلامی نظام زندگی سے مصالحت یا مداہنت کا تصور بھی حرام ہے چنانچہ جب قرآن نازل ہو رہا تھا اور ملت اسلامیہ کی بنیادیں بھری جارہی تھیں تو اس کو مخالف کیمپ سے اس پالیسی کے اختیار کر لینے کی بار بار ترغیب ملتی رہی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطعی ہدایت تھی کہ پیغمبر اور ان کے ساتھی اس ترغیب کو ہرگز خاطر میں نہ لائیں۔ مثلاً اس کیمپ نے جب اپنی اسلام دشمن تدبیروں اور سرگرمیوں کو کسی طرح بھی کامیاب ہوتے نہ دیکھا تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ:-

ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (یونس :۱۵)

"اس قرآن کے بجائے کوئی دوسری کتاب لائیے۔ یا پھر اس میں ردوبدل کر دیجئے۔"

اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا منشاء صاف ظاہر ہے۔ دراصل یہ ایک تجویز یا مطالبے سے زیادہ ان کی طرف سے ایک پیش کش تھی۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ محمد (ﷺ) اپنی تعلیمات میں

ہمارے مشرکانہ افکار و عقائد کے لیے بھی کوئی گنجائش نکال دیں تو ہم ان کی مخالفت سے باز آجائیں گے اور ان کی بات مان کر ان کے پیرو بن جائیں گے۔ ان کی اس تجویز یا پیش کش کا جو جواب اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے دلایا وہ یہ تھا:۔

قُلْ مَایَكُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِیْ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلاَّ مَایُوْحٰۤی اِلَیَّ.

(یونس: ۱۵)

"ان سے کہہ دو کہ مجھے اس بات کا قطعاً کوئی استحقاق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس قرآن میں کوئی ردوبدل کردوں۔ میں تو بس اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے۔"

اصولی اور بنیادی باتیں تو خیر بڑی چیز ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے پیغمبر کو اس بات سے بھی پوری سختی کے ساتھ خبردار کر دیا تھا کہ خواہ حالات کا تقاضا اور وقت کی مصلحت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ شریعت کے کسی ایک جزوی قانون کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے:۔

وَاَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلاَ تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ. (المائدۃ:۴۹)

"اے پیغمبر! ان کے درمیان اس قانون کے مطابق فیصلہ کرو جسے اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، اور (دیکھو) اس بات سے ہوشیار رہو کہ کہیں یہ لوگ تم کو اس ہدایت کے کسی جز سے (غافل کر کے) فتنہ میں نہ ڈال دیں جس کو اللہ نے تم پر اتارا ہے۔"

یہ تو اسلامی تعلیمات میں کسی بنیادی یا جزئی ترمیم کی خواہش اور کوشش کا معاملہ تھا۔ اس کے بعد دوسرے درجہ پر ان کی ایک اور خواہش اور کوشش ہوئی، اور وہ یہ کہ کاش محمد ﷺ تبلیغ دین کے بارے میں مداہنت سے کام لیں تو وہ بھی یہی پالیسی اختیار کر لیں:۔

(وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ (القلم: ۹)

اور یوں یہ کش مکش ختم ہو جائے۔

"مداہنت سے کام لینے" کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ شرک کی تردید سے باز آجائیں۔ اور اپنی دعوت توحید کو صرف اثباتی پہلو سے پیش کرنے پر اکتفا کر لیں۔ گویا ان کی پہلی تجویز یا پیش کش، اسلام اور شرک کا آمیزہ بنا لینے کی خواہش تھی تو یہ دوسری پیش کش اسلام اور

شرک کے "پرامن باہمی وجود" کی خواہش تھی۔ مگر جس طرح پہلی کے منظور کرلیے جانے کو ناممکن فرمایا گیا اسی طرح اس دوسری خواہش کو بھی یک لخت ٹھکرادیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی کو حکم دیا کہ اس طرح کی باتیں ہرگز نہ مانیں۔ (فَلَا تُطِعْ كُلَّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ)۔

یہ قرآنی تصریحات اسلام کے اصولوں ہی کا نہیں بل کہ اس کی جمیع تعلیمات اور اس کے مخصوص مزاج، سب کا مقام بالکل واضح طور سے متعین کردیتی ہیں۔ ان کے بعد کسی شخص کو یہ کہنے کی اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی کہ اسلام کو اپنا لینے یا اپنائے رکھنے کے باجود اس کے اصولوں کی پیروی میں انسان آزاد ہے اور حسب ضرورت ان میں ترمیم کرلے سکتا ہے۔

مقصد شناسی کا معیاری نمونہ

عملاً آج امت مسلمہ کی جو حالت بھی ہو مگر اپنی زندگی کے آغاز میں ہر بااصول جماعت کی طرح یہ جماعت بھی اپنے مقصد کا گہرا عشق اور اپنے اصولوں کا سچا یقین لے کر اٹھی تھی۔ اور اس طرح اٹھی تھی کہ رکاوٹوں کی کوئی بڑی سے بڑی چٹان بھی اس کا رخ نہ موڑ سکی۔ اس راہ میں اسے کیا کچھ پیش نہیں آیا۔ جانی اور مالی مصیبتوں نے اس پر یورش کی، سخت ترین خطرات نے اسے دھمکایا، رات کی نیند اس کی چھنی، دن کا سکون اس کا برہم ہوا، قید وبند کی آزمائشوں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ مگر تاریخ گواہ ہے، اور اس کی اس گواہی کو کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا کہ ہولناک مصائب اور مشکلات کے اس اُمڈتے ہوئے طوفان میں بھی یہ جماعت اپنے اصل موقف سے ایک انچ ہٹنے پر بھی کبھی راضی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اگر وہ مصالحت اور مداہنت کو ذرا بھی راہ دے دیتی تو یہ سارا ہنگامۂ مصائب یک دم سرد پڑ جاتا۔ دن رات کی بے اطمینانیاں امن وسکون سے بدل جاتیں۔ معاشی تنگیاں بھی[۱] دور ہوجاتیں اور پورا عرب اس کی سیاسی برتری کو بھی بڑی آسانی سے تسلیم کرلیتا۔ جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے، اور قرآن کے کھلے ہوئے اشارات سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لیڈر اور پیرو سبھی جانتے تھے کہ مداہنت یعنی شرک اور توحید کے پرامن باہمی وجود کی

---

[۱] قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صاف لفظوں میں یہ پیش کش کی تھی کہ اگر آپ ہمارے معبودوں کے خلاف تنقید کرنے سے باز آجائیں تو ہم نہ صرف یہ کہ آپ کی مخالفت ترک کردیں گے، بل کہ آپ کے حسب خواہش آپ کی خدمت میں مال ودولت بھی لاکر ڈھیر کردیں گے اور آپ کو اپنا سردار بل کہ بادشاہ بھی بنا لیں گے۔ (سیرت ابن ہشام، جلد اول)

دعوت، ان کے لیے موت کی دعوت ہے۔ کیونکہ اپنے اصولوں کو چھوڑ دینے کے بعد ان کا وجود اپنے مقصد کے لحاظ سے بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے یہ لوگ آگ اور خون کے طوفانوں میں بھی اپنے مرکز پر جمے رہے۔ اور حالات کی کوئی ناسازگاری یا مصلحت انہیں اپنے مسلک سے بال برابر بھی نہ ہٹا سکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے تمام ہنگامی مسئلوں، مادی مصلحتوں، ظاہری تدبیروں اور وقت و ماحول کے تقاضوں سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ بس ایک "جنون" ہے، جس نے انہیں "عقل و دانش" کا دشمن بنا ڈالا ہے۔ چنانچہ اس زمانے کے سیاستدانوں اور مدبروں کا متفقہ فیصلہ ان کے بارے میں یہی تھا بھی کہ "انہیں ان کے دین نے فریب میں مبتلا کرر کھاہے" غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ اور یہ کہ یہ "سُفَهَآءُ" ہیں۔

اگرچہ دنیا نے جلد ہی اس "خود فریبی" اور "سفاہت" کی حقیقت دیکھ لی، اور زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ تاریخ انسانی کا وہ حیرت انگیز انقلاب وجود میں آیا جس کی منطقی توجیہ کرنے میں بڑی بڑی عقلیں دنگ ہیں۔ جن کو اپنے گھروں میں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی، قیصر و کسریٰ کے تاج ان کے قدموں میں آپڑے۔ اور ایک صدی بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ وہ یورپ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصوں پر چھاگئے۔ صرف ان کی زمینوں ہی پر نہیں بل کہ وہاں رہنے والوں کے دلوں اور دماغوں پر بھی۔ یہ سب کچھ یقیناً اسی گہری فدویت اور وفاداری کے طفیل ہوا جو ان کے دلوں میں اپنے مقصد وجود اور اپنے اصول حیات کے لیے موجود تھی، اور جس نے انہیں انہی کے لیے جینا اور مرنا سکھادیا تھا۔

مقصد شناسی کا زوال

اسلام کے اس ابتدائی دور کے گذر جانے کے بعد اس امت پر وہ دور آیا جب اس کے افراد کے ذہنوں میں اپنے مقصد زندگی کے نقوش ماند پڑنے شروع ہوئے اور مختلف اسباب کے تحت ان کے اندر مداہنت کی بیماری جڑ پکڑنے لگی، اور زمانے کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتی گئی۔ غیر اسلامی اصول و نظریات مسلمانوں میں اس طرح پھیلنے لگے جیسے کسی دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ ان کی روک تھام کے لیے علمائے حق کی طرف سے بہت کچھ کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ مگر ناتربیت یافتہ عوام کی خام مذہبیت اور حکومتوں کی نافرض شناسی نے ان کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہ ہونے دیا اور یہ بیماری مسلم معاشرے کے اندر آہستہ آہستہ اسلامی اصول وافکار کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہی۔ جب تک اس جماعت کا سیاسی اقتدار قائم رہا اس وقت تک تو ان اصولوں کے بارے میں اس

نے مجموعی حیثیت سے خود فراموشی اور خود کشی کی راہ نہیں اختیار کی۔ مگر جب سیاسی زوال نے بھی اسے آلیا تو اس فکری زوال کی تیز رفتاری سیلاب سے باتیں کرنے لگی اور ہوتے ہوتے اب وہ وقت آپہونچا ہے کہ یہ جماعت اپنے آپ کو گویا پہچانتی ہی نہیں اس کے افراد کی بہت بڑی اکثریت اپنے اصول و مقاصد، اپنے مسلک اور اپنے وجود کی غرض و غایت کو اس طرح بھول چکی ہے کہ اگر ان چیزوں کو سامنے رکھا جائے تو وہ نہ صرف یہ کہ ان سے اجنبیت محسوس کرتی ہے بل کہ بسا اوقات پورے اطمینان اور ادعائے تحقیق کے ساتھ اس کو غیر اسلام یا زائد از اسلام ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگتی ہے۔ جو چیزیں ان اصولوں کی بالکل مخالف ہیں وہ ان پر دیوانہ وار ٹوٹی پڑتی ہے اور انہیں مطابق اسلام قرار دینے پر مصر ہو جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تمام تر جد و جہد اپنے ہی مقصد حیات کی پامالی میں صرف ہو رہی ہے۔ اگر چہ خوش فہمی یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسلام اور امت مسلمہ کی سرفرازی کا باعث ہوگا! بظاہر یہ محض ایک دعوی ہے مگر یہ دعوی ایسا ہے جو دلیل سے بے نیاز ہے۔ اللہ نے جس کسی کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں دی ہیں وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ حقیقتِ واقعہ اس کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اس سے انکار نہیں کہ ایک چھوٹی سی اقلیت ایسے لوگوں کی بھی اس جماعت میں موجود ہے جو بحمد اللہ خود فراموشی اور خود کشی کے اس مقام تک ابھی نہیں پہونچی ہے، بل کہ اس کی نگاہ اپنے نصب العین کے جلووں سے ابھی تک آشنا ہے اور وہ اسلام کے اصول و مقاصد کی یاد اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ لیکن انکار اس بات کا بھی تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس خود شناس اقلیت کے بیشتر افراد کا حال بھی عملی نقطہ نگاہ سے کچھ قابل اطمینان نہیں، اور ان کے اندر یہ یاد محض ایک متبرک یادگار بن کر رہ گئی ہے جس میں زندگی کی حرارت یا تو رہی نہیں، یا اتنی مدھم پڑ چکی ہے کہ محسوس نہیں ہوتی۔ حالات کی ناسازگاری اور مخالف قوتوں کی قہاری نے ان کے سروں میں وہ سودا ہی باقی نہیں رہنے دیا جس کے بغیر کسی بڑے مقصد اور اصول کا نام لینا کبھی زیب نہیں دیا کرتا۔ اس لیے ان لوگوں نے بھی خاموش مصالحت کی پر امن روش اختیار کر رکھی ہے، اور اس بات کی احتیاط رکھنا گویا ان کی مستقل پالیسی بن گئی ہے کہ ان پر "سیاست و تدبر" کی طرف سے "مذہبی مجنون" ہونے کا الزام نہ لگنے پائے، وہ دیکھتے اور جانتے سب کچھ ہیں مگر اپنے کو یہ "سمجھا کر" خاموش ہیں کہ دین میں آسانی رکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں قرار دیا ہے بل کہ ایسے اقدام و عمل سے باز رہنے کی وصیت فرمائی ہے جس میں مہلکے ہوں۔

امت "نقمت بقدر رحمت" کے قانون کی زد میں

ان حالات میں یہ جماعت اگر آج دنیوی جاہ واقبال کی مالک ہوتی تو بھی اسلام کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ اس کا مجرد سیاسی اقتدار اس کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتا ہی نہیں۔ اس کو تو جو کچھ بحث اور دلچسپی ہے صرف اپنی اقامت سے ہے۔ اس نصب العین کو پس پشت ڈال کر اس کا نام لینے والوں نے ہفت اقلیم کی شہنشاہی بھی حاصل کر لی تو اس کے کس کام کی؟ مگر قدرت نے یہ چیز بھی تو آج ان کے پاس باقی نہیں رہنے دی ہے۔ انہوں نے اپنے مقصد وجود کو دیوار پر پھینک کر جو کچھ پایا وہ محکومی یا نیم محکومی کا وہ داغ ہے جو ہر جماعت کی پیشانی پر تو لگ سکتا ہے مگر سلطان کائنات کی پارٹی۔ حزب اللہ۔ کی پیشانی پر ہرگز نہیں لگ سکتا۔ یہ داغ اتنا گھناؤنا ہے کہ ہر دیکھنے والے کو اس پر حیرت ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ امت کے ابتدائی دور میں اس کے عروج کو دیکھ کر حیرت ہوا کرتی تھی۔ یعنی عروج وزوال کے عام فلسفے کی رو سے امت مسلمہ کا عروج بھی ایک معجزہ تھا اور اب اس کا یہ زوال بھی ایک "جوابی معجزہ" ہے۔ عقلیں نہ اس غیر معمولی اقبال کی کوئی اطمینان بخش توجیہہ کر پاتی ہیں اور نہ اس غیر معمولی ادبار کی۔ حد یہ ہے کہ خود اس امت کی بہت بڑی اکثریت بھی حیرت زدہ ہے کہ یہ کیا سے کیا ہو گیا؟ وہ رہ رہ کر یہ سوچتی ہے کہ آخر ہماری ایسی زبوں حالی کا سبب کیا ہے؟ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہمارے ایمان میں کمزوری آگئی ہے۔ ہم بدعمل ہو گئے ہیں۔ ہمارے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں۔ ہم احکام دین سے غافل ہیں۔ یہ سب کچھ سہی مگر پھر بھی برے بھلے جیسے ہیں آج اس دنیا میں صرف ہم ہی توحید کے تنہا علمبردار ہیں۔ ہم اگر سر جھکاتے ہیں تو خدا ہی کے سامنے جھکاتے ہیں۔ اس کے رسول پاک کا حلقہ اطاعت ہے تو صرف ہماری گردنوں میں ہے۔ اس کے احکام پر اگر کچھ عمل کرتے ہیں تو ہم ہی کرتے ہیں۔ اور ہمارے بالمقابل ساری دنیا کافر ومشرک ہے۔ خدا کی باغی اور توحید کی منکر ہے۔ رسولؐ کی مخالف اور قرآن کی دشمن ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم پست اور وہ سربلند، ہم مفلس اور وہ دولت مند، ہم ذلیل وخوار اور وہ صاحب اقتدار، ہم غلام ومحکوم اور وہ آزاد وحکمراں! حالانکہ جب ہم بہر حال غیروں کی بہ نسبت اللہ سے زیادہ قریب ہیں تو ان کے مقابلے میں ان الٰہی انعامات کے زیادہ مستحق ہم تھے نہ کہ وہ۔

یہ حیران کن سوال دراصل اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہم قوموں کے عروج وزوال کے اس فلسفے سے ناواقف ہو گئے ہیں جسے قرآن حکیم نے بیان فرمایا ہے۔ ورنہ طبعی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے ہم ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں ہونا چاہیے تھا۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے

میدان میں دو قسم کے قوانین کار فرما ہیں۔ ایک تو قوانین طبعی دوسرے قوانین اخلاقی[1]۔ قوموں کے اٹھانے اور گرانے میں یہ دونوں ہی قسم کے قوانین کام کرتے ہیں۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ تنہا قوانین طبیعی تو ایک قوم کو میدانِ مقابلہ میں فتح وغلبہ دلا سکتے ہیں۔ لیکن قوانین اخلاقی میں مشیت نے یہ قوت نہیں رکھی ہے کہ وہ طبیعی قوانین کی تھوڑی بہت مدد لیے بغیر بھی اکیلے ہی کسی قوم کو غالب وفتح مند بنا دیں۔ قوانین اخلاقی کو دراصل قوموں کی باہمی کش مکش اور جنگی معرکوں میں "خصوصی اختیار فیصلہ" کا مقام حاصل ہے، اور اس خصوصی اختیار کا استعمال وہ طبیعی قوانین اور مادی قوتوں کی موجودگی ہی میں کرتے ہیں۔ یعنی اگر دونوں فریقِ جنگ صرف مادی تیاریوں کے ساتھ نبرد آزما ہوں تو فتح اس کی ہوگی جو لڑائی کے اسباب وذرائع زیادہ لے کر میدان مقابلہ میں آیا ہوگا۔ اور اگر صرف ایک طرف مادی قوتیں ہوں اور دوسری طرف محض اخلاقی اور روحانی قوتیں ہوں تو فریقِ ثانی کا شکست کھانا یقینی ہے، بل کہ اسباب وعلل کی اس دنیا میں فی الواقع یہ مقابلہ کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ لیکن اگر مادی تدابیر اور اسباب وذرائع کے اعتبار سے دونوں فریق برابر ہوں مگر ساتھ ہی ایک فریق اخلاقی قوتوں سے بھی مسلح ہو تو بلاشک وشبہ غلبہ اسی کو حاصل ہوگا اور اس کی اخلاقی قوتیں بڑھ کر اس جنگ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیں گی، جسے فریقین کے یکساں مادی سروسامان کے باعث بظاہر کبھی ختم ہی نہ ہونا چاہیے تھا۔ بل کہ اس سے بھی بڑھ کر قرآنی تصریحات تو یہاں تک بتاتی ہیں کہ اگر مادی وسائل میں وہ فریقِ مخالف کا دسواں حصہ ہو تو بھی اس کی اخلاقی قوتیں خصوصی "اختیار فیصلہ" بن کر اسے فتحیاب بنا دیتی ہیں۔ اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ یہ قوتیں اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور مافوق الطبیعی نصرت کا ذریعہ بن جاتی ہیں، بشرطیکہ ایک طرف تو اس نے اپنے مقدور بھر مادی وسائل اور تدابیر سے کام لینے میں دریغ نہ کیا ہو اور دوسری طرف اپنے ایمان کو خوب راسخ اور اپنے اعمال کو صالح بنا لیا ہو۔ یا یوں کہیے کہ اس کے اندر اپنے اصولوں کا حقیقی عشق اور اپنے مسلکِ زندگی کا زندہ جنون موجود ہو۔ اس غیبی مدد اور مافوق الطبیعی نصرت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح وعدے کیے گئے ہیں مثلاً:۔

---

[1] "اخلاقی" سے مراد یہاں حقیقی دینی اخلاق ہیں نہ کہ افادی اور تجربی اخلاق، ورنہ افادی اخلاقیات سے بھی کوئی قوم اگر بے بہرہ ہو تو وہ محض طبیعی قوانین کے بل پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتی۔ اس جگہ افادی اخلاقیات کو بھی طبیعی قوانین ہی کے اندر شمار کیا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مادی تدابیر کے سوا کچھ نہیں۔ انہیں اخلاق کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔

(۱) كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢبِاِذْنِ اللّٰهِ. (البقرۃ:۲۴۹)

"کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب ہوئی ہیں۔"

(۲) وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.

(آل عمران:۱۳۹)

"نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو۔ تم ہی اونچے رہو گے۔ بشرطیکہ تم مومن ہو۔"

(۳) اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (الانفال:۶۵)

"اگر تمہارے بیس ثابت قدم اشخاص ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے۔"

(٤) اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء:۱۰۵)

یقیناً زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

(۵) وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ

(المائدۃ:۵٦)

"اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کو اور مومنوں کو اپنا ساتھی بنائے گا تو (وہ بامراد اور سر بلند ہو گا)۔ بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔"

اس غیبی مدد کے ظہور کی مثالیں ہر دور میں پائی جا سکتی ہیں۔ خود اس امت کی ابتدائی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بدر و اُحد اور احزاب و حنین کے معرکوں میں خدا کی "ان دیکھی" فوجوں نے جو کرشمے انجام دیئے، قرآن کے صفحوں میں وہ آج بھی محفوظ ہیں۔

یہ ہے مخصوص ضابطہ کسی مومن گروہ کے عروج کا، اور یہی مخصوص ضابطہ تھا جس نے امت مسلمہ کا ابتدائی دور غیر معمولی عظمت اور سر بلندی کا دور بنا دیا تھا۔

لیکن جہاں دوسری اہل ایمان جماعتوں کی طرح اس جماعت کو بھی قدرت کی یہ خصوصی نظر عنایت حاصل ہے وہیں اس کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک ہیں اور اسکو اس خاص وعدے کے ساتھ ایک خاص وعید سے بھی خبردار کیا جا چکا ہے جس کی طرف سے افسوس ہے کہ اس نے اپنے کان بند کر لیے ہیں۔ اور یہی کان بند کر لینا ہی دراصل اس کے لیے غلط فہمیوں اور ہلاکتوں کا باعث بنا ہے۔ اور وہ سوال پیدا کر گیا ہے۔ جس کو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اس اجمال کی شرح یہ ہے کہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کا جو قانون بیان فرمایا ہے اس کی رو سے جس فرد یا گروہ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے اس فضل و کرم کی ناشکری یعنی احکام

الٰہی سے بے پروائی برتنے پر اس کی پکڑ بھی اتنی ہی زیادہ سخت اور ہولناک ہوتی ہے۔ محکومی و نامرادی کی جتنی سزا وہ دوسری قوموں کے برے اعمال کی پاداش میں دیا کرتا ہے اتنے ہی برے اعمال کے ارتکاب پر اس قوم کو اس سے دوگنی یا کئی گنی سزائیں دیتا ہے جو اس کے کچھ مخصوص انعامات سے سرفراز کی جا چکی ہو۔ قرآن حکیم کی چند شہادتیں سنئے۔ سب سے پہلے خود نبی کریم ﷺ کی ذات عالی مقام کو لے لیجئے، جن سے بڑھ کر محبوب اور مقرب بندہ عالم وجود میں آیا ہی نہیں۔ مگر یہ بات اسی محبوب ترین بندے کو مخاطب کر کے کہی گئی تھی کہ :

وَلَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلاً اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لاَ تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا.

(بنی اسرائیل: ۷۴۔۷۵)

"اگر ہم تم کو (حق پر) ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کفار کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہم اس وقت تم کو زندگی اور موت دونوں میں (یعنی دونوں جہانوں میں) دہرا عذاب چکھاتے پھر تم ہمارے خلاف کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔"

دوسری مثال ازواجِ مطہراتؓ کی لیجئے۔ ان کو جہاں یہ رتبہ بخشا گیا تھا کہ وہ "امہات المومنین" ہیں اور ان کی حیثیت عام عورتوں جیسی نہیں ہے (يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ) نیز یہ کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی صدقِ دل سے تابعداری کریں اور اچھے کام کریں تو عام لوگوں کی بہ نسبت ان کو دوگنا اجر ملے گا (وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، وَتَعْمَلْ صٰلِحاً نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقاً كَرِيْماً.) (احزاب: ۳۱) وہیں اس حقیقت سے بھی انہیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ:۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ

(احزاب: ۳۰)

"اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہو گی، اس کو دوگنا عذاب دیا جائے گا"۔

افراد کے بعد قوموں کی مثال لیجیے۔ یہودی قوم وہ قوم ہے جس پر مدتوں انعامات الٰہی کی بارشیں ہوتی رہیں۔ جس کو دشمن سے بچانے کے لیے سمندر خشک کر دیا گیا۔ جس کی معاشی

مشکلات کے وقت من وسلویٰ کا نزول ہوتا رہا۔ لق ودق بیابانوں میں جس کی سر پر رحمت کے فرشتے بدلیوں کی چھتریاں تانے ساتھ چلتے تھے اور جس کو تمام اقوامِ عالم پر برتری دی گئی تھی۔ لیکن جب اسی سر بلند اور محبوب جماعت، اور موجودہ توریت کے لفظوں میں "خدا کی اپنی قوم" نے اپنے عہد بندگی کو فراموش کردیا اور احکام الٰہی سے سر تابی کر کے فسق وفجور میں غرق ہو گئی تو اس پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑا اور اس طرح ٹوٹا کہ یہ قوم پہلے جتنی سر بلند تھی اب اتنی ہی ذلیل ہو گئی۔ جس قدر محبوب تھی اسی قدر مغضوب ہو رہی۔

غرض یہ اللہ تعالیٰ کی کبھی نہ بدلنے والی سنت ہے کہ اس کی نقمت بقدر رحمت ہوا کرتی ہے اور جیسا کہ چاہیے، یہ سنت ٹھیک عدل پر مبنی ہے۔ چنانچہ عام انسانی فطرت بھی اسی روش پر عمل پیرا ہے۔ ہم ایک اجنبی آدمی سے اس حسن سلوک کے امیدوار نہیں ہوتے جس کی امید ہمیں اپنے اعزہ سے ہوتی ہے۔ ایک غیر شخص اگر ہماری باتوں کو نہیں مانتا۔ اس کی تکذیب اور مخالفت کرتا ہے تو ہم اس پر زیادہ رنجیدہ یا مشتعل نہیں ہوتے۔ لیکن یہی بات اگر اپنے کسی نمک خوار نوکر یا ناز پروردہ بیٹے سے سرزد ہو جائے تو اس وقت ہمارے غم وغصہ کی انتہا نہیں رہتی اور ہم اس کی اس حرکت کا وہ جواب دیتے ہیں جو ایک غیر آدمی کو کبھی نہیں دے سکتے۔ اس فرق کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ غیر کی مخالفت کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ایک سچی بات کا منکر اور دشمن ہے، لیکن اس یگانے کی مخالقت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مخالفت حق کے ساتھ ساتھ نمک حرامی بھی موجود ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے جسے انسانیت کا ضمیر کبھی معاف نہیں کرتا۔ بالکل یہی اصول اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کے بارے میں برتتا ہے اور ان افراد یا اقوام کو جو اس کی مخصوص عنایتوں سے سرفراز ہونے کے باوجود اس کے احکام کی مخالفت پر اتر آتی ہیں عام حالات کی بہ نسبت دوگنی سزائیں دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بیک وقت دو جرموں کی مرتکب ہوتی ہیں۔ ایک تو مخالفتِ حق کی۔ دوسرے احسان کشی اور نمک حرامی کی۔

اسی سنت الٰہی کی روشنی میں امت مسلمہ کے ماضی اور حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا.........اس امت کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس نے اس امت کو تقریباً وہ ساری کی ساری نعمتیں بھی بخشیں جو اس سے پہلے دوسری تمام امتوں کو دی گئی تھیں، اور ان کے علاوہ وہ نعمتیں بھی جو اب تک کسی امت کو نہیں ملی تھیں۔ آخر یہ سارے جہان کی امامت کا منصب[۱] اور سب سے بہتر امت[۲] ہونے کا اعزاز، یہ امت[۳] وسط اور شہداء علی الناس[۴] کے خطابات، یہ

اکمال[۵] دین اور اتمام[۶] نعمت کے انعامات اس سے پہلے بھی کسی امت کو ملے تھے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر غور کیجئے کہ اس امت کی ذمہ داریاں کتنی بھاری ہوں گی اور ان ذمہ داریوں کے چھوڑ بیٹھنے کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ جزاوسزا کا جو قانون اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین پیغمبر اور اس پیغمبر کی محترم ازواجؓ کے حق میں بھی اتنا بے لچک تھا وہ دوسروں کے بارے میں کوئی نرمی کیسے دکھا سکتا ہے؟ اگر اس "بہترین امت" کا عملی ریکارڈ ویسا ہی یا قریب قریب ویسا ہی ہے جس کے لیے وہ مبعوث کی گئی تھی تو یقیناً اسے اپنی موجودہ زبوں حالی پر تعجب کرنے کا پورا حق ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے مقصد وجود سے غافل ہو چکی ہے تو پھر اسے تعجب اپنی حالت پر نہیں، بل کہ اپنی سادہ لوحی اور اپنی خوش فہمی پر کرنا چاہیے۔ آخر قدرت نے کب اور کس پر ظلم کیا ہے جو آج وہ اس امت کے بارے میں انصاف کو بھول گئی ہو گی اور بھول کر اسے بلاوجہ پستی کے گڑھے میں ڈھکیل گئی ہو گی۔ ذرا دیکھ تو لیجئے کہ اس امت کی ذمے داری کیا تھی؟ اور اس وقت وہ اسے ادا کس طرح کر رہی ہے؟ اس کی ذمہ داریوں کا ضروری تعارف تو اگرچہ ابھی پچھلے باب میں نظروں سے گذر چکا ہے، لیکن مناسب ہو گا کہ بعض اور تصریحات بھی سن لی جائیں۔ قرآن مجید مسلمانوں سے کہتا ہے:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف:۳)

"تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو اور اسے چھوڑ کر دوسرے جھوٹے خداوندوں کا اتباع نہ کرو۔"

مسلمان کا کیا رویہ ہونا چاہیے اور اسے کارزار حیات میں کونسا کردار ادا کرنا ہے، قرآن مجید کا صرف یہی ایک جملہ اس سوال کا مثبت اور منفی ہر پہلو سے واضح جواب دے دیتا ہے۔ اس سے یہ بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ کیا نہ کرنا چاہیے؟ ایک طرف تو ہر

۱، ۲۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ آل عمران ۱۱۰ (تم بہترین امت ہو جو تمام لوگوں کی (امامت و رہنمائی) کے لئے برپا کی گئی ہے۔ الخ)

۳، ۴۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ۔ ۱۴۳)

(اور اس طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت سے بنایا ہے تاکہ تم سب لوگوں کے لئے حق کے گواہ بنو۔)

۳، ۶۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ۔ مائدہ، ۳ (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی)

وہ حکم اور ہدایت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہو اس کے لیے واجب التعمیل ہے، خواہ اس کا تعلق عقائد اور عبادات سے ہو خواہ اخلاق اور معاملات سے، انفرادی مسائل سے ہو یا اجتماعی سے، مسجد اور مدرسے سے ہو یا گھر اور بازار سے، اسمبلی اور پارلیمنٹ سے ہو یا بزم صلح اور میدان جنگ سے، غرض کوئی موقع ہو یہی احکام وہدایات اس کے نظریوں کی بنیاد ہوں گے یہی اس کے رویے کا فیصلہ کریں گے۔ اور انہی کا پابند ہو کر اسے رہنا پڑے گا۔ دوسری طرف اپنے اس حقیقی مالک کے سوا اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبرؐ کے علاوہ اگر کسی اور جانب سے کوئی نظریہ، کوئی اسوہ، کوئی ضابطہ اور کوئی فیصلہ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ لازماً اس کے لیے قابل رد ہے۔ جیسا ضروری اس کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے ہر حکم کو بجالائے ٹھیک ویسا ضروری امر یہ بھی ہے کہ وہ ہر بیرونی شے کو دیوار پر دے مارے۔

قرآن کے اس مطالبے کو سننے کے بعد دو ہی راہیں اختیار کی جاسکتی ہیں، یا تو اس کا انکار کردیا جائے، یا پھر غیر مشروط طریقے پر سر تسلیم خم کردیا جائے۔ انکار کرنے کے معنی جس طرح یہ ہیں کہ انسان قرآن کو حق نہیں مانتا اور امر و حکم کو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص نہیں سمجھتا، اسی طرح اس مطالبے کو غیر مشروط طریقے سے تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تسلیم کرنے والا قرآن کو برحق تو مانتا ہی ہے اب وہ اس بات کا بھی اقرار واعلان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی ایک ہدایت کی بھی پابندی سے گریز نہ کرے گا۔ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی اور سادہ سی حقیقت ہے جس سے کسی اختلاف کی بابت سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ اب اس حقیقت کے ہوتے ہوئے دین کی صرف بعض پابندیوں کو قبول کرنے اور بعض سے کترا کر نکل جانے کا رویہ جتنا غیر معقول اور مضحکہ خیز ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں، جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس نے ایسی بین بین کی روش اختیار کرنے والوں کو اپنا فیصلہ ان صاف اور صریح لفظوں میں سنا رکھا ہے:۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَاجَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ.

(البقرۃ:۸۵)

"کیا تم کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے۔ سو ایسا کرنے والوں کی سزا اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں ذلیل وخوار ہوں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف لے جائے جائیں۔"

قرآن کا یہ فیصلہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اس کا مطالبہ کامل حوالگی کا ہے۔ یعنی وہ جو کچھ بھی کہے اس پر، اور صرف اسی پر، عمل ہونا ضروری ہے۔ اس نے اپنے پیرووں کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو حدیں قائم کردی ہیں ان کے آگے قدم اٹھانے کی ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا کرنے والوں کو وہ ظالم قرار دیتا ہے۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (بقرہ:۲۲۹) اس لیے قرآن پر ایمان لانے اور مسلم ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کے کسی ادنی سے ادنی جزو کو بھی ترک نہیں کیا جاسکتا۔

اب ذرا سرسری نظر سے یہ بھی دیکھ ڈالیے کہ یہ امت اپنی اس ذمے داری کو پورا کس طرح کررہی ہے؟ دماغ کو تمام خارجی اثرات سے آزاد کرکے "مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ" پر اول سے آخر تک نظر ڈال جایئے اور اس کے بعد امت کے پورے عملی رویے کا گہرا جائزہ لیجیے۔ پھر اندازہ کیجیے کہ قرآن کے کتنے احکام پر عمل ہو رہا ہے! چھوڑ دیجیے ان لوگوں کو جو مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلام کے علانیہ باغی اور اس کے اصولوں کی سچائی سے منکر ہیں یا جن کی زندگی کے لمحات ایک ایک کرکے اسلامی قوانین کے توڑنے بل کہ مٹانے ہی میں صرف ہوتے رہتے ہیں۔ اور جن کو فقہی اصطلاح میں فاسق و فاجر کہا جاتا ہے۔ ان افراد.........اور حلقوں کی طرف نگاہ دوڑایئے جو نیکی اور تقوی اور ایمان وعمل کے لحاظ سے اگلی صفوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کو جو کچھ دکھائی دے سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ان احکام الہی سے جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے وہ غفلت نہیں برتتے، نمازوں اور روزوں کی پوری پوری پابندی ہوتی ہے اور اوراد و وظائف کی کثرت ہے۔ زکوٰۃ و صدقات ادا ہو رہے ہیں۔ جھوٹ، غیبت، بدگوئی اور بہتان تراشی سے زبان آلودہ ہونے نہیں پاتی۔ کبر و غرور، نمود وریا، خیانت و بدعہدی، ظلم اور رشوت، غصب اور حرام خوری اور فتنہ و فساد کے دھبوں سے ان کے ایمان کا دامن پاک رہتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جہاں تک دین کے اجتماعی احکام و مسائل کا تعلق ہے ان سے غفلت و بے اعتنائی کا حال ان حلقوں میں بھی وہی ہے جو غیر متقی حلقوں میں نظر آتا ہے۔ قرآن نے اگر زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہی بحث کی ہوتی تب تو بلاشبہہ اس طرح اتباع قرآن کا حق ادا ہو جاتا۔ مگر وہ تو زندگی کے اجتماعی مسائل کو بھی اتنی ہی اہمیت کے ساتھ لیتا ہے جتنی اہمیت سے کہ اس نے انفرادی مسائل کو لیا ہے۔ اس نے نماز، روزے، حج اور زکوۃ کے فرائض ادا کرنے اور دیانت، امانت، راست گوئی، اخلاص، وفائے عہد، حسن سلوک اور اکل حلال وغیرہ اخلاق فاضلہ پر

کاربند ہونے کی ہدایتیں دینے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق اور آفاقی و فرمانروائی کا مستحق نہیں، اس لیے اسی کو اپنا معبود، آقا اور سلطان مانو (لآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ) (اِنِ الحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ)(یوسف:۴۰) (اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ. (الاعراف۔۵۴) خدا ہی کی بندگی کرو اور تمام باطل معبودوں کو چھوڑ دو (اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُو الطَّاغُوْتَ. (النحل:۳۶) خدائی اور فرمانروائی کے ان تمام جھوٹے مدعیوں کے دعوے تسلیم کرنے سے انکار کر دو جو خدا کی بادشاہت سے باغی ہو کر اس کی رعایا پر اپنا حکم چلانا چاہتے ہیں۔ "وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ" (النساء:۶۰) ان لوگوں کا کہنا نہ مانو جو اللہ کے حقوق سے غافل اور اس کی حدود کو توڑنے والے ہیں "وَلاَ تُطِیْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ" (شعراء:۱۵۱) جب فیصلہ کرو تو احکام الٰہی کے مطابق کرو "وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ۔ (مائدہ۔۴۹) جب اپنا فیصلہ کراؤ تو انہی احکام کے تحت کام کرنے والی عدالتوں سے کراؤ، ورنہ غیر الٰہی قوانین کی عدالت میں اپنا معاملہ لے جانے والا منافق ہے "یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ۔ (نساء۔۶۰) اور قوانین الٰہی کو چھوڑ کر ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا ظالم، فاسق اور کافر ہے "وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ......... الْفٰسِقُوْنَ۔ (مائدہ:۴۴ تا ۴۷) کسی برائی اور کسی ظلم کے پروان چڑھانے میں کسی طرح کا تعاون نہ کرو "وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (مائدہ۔۲) کفر کے علمبرداروں سے لڑو یہاں تک کہ کفر کا علم سرنگوں ہو جائے اور اللہ ہی کی اطاعت رہ جائے (وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَاتَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ۔ (البقرہ:۱۹۳) جو کوئی اللہ اور اسکے رسول سے لڑے اس سے خدا کی زمین پر زندہ رہنے کا حق چھین لو۔ "اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا۔ (المائدہ:۳۳) جو چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو "وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا. (المائدہ:۳۸) جو بدکاری کرے اس کو سو کوڑوں کی سزا دو "اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ" (نور:۲) جو کوئی کسی پاک دامن پر زنا کا جھوٹا الزام لگائے اس کو اسی درے لگاؤ۔ "وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَۃً۔ (نور:۴) جو کوئی کسی کو عمداً قتل کر دے اس کی بھی گردن اڑا دو "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ. الخ۔ (بقرہ:۱۷۸) غرض یہ اور انہی جیسے بے شمار احکام شریعت ایسے بھی ہیں جو ہماری انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر ہماری اجتماعی زندگی کو بھی اپنا پابند بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور یہ سب کے سب اسی قرآن میں موجود ہیں

جس میں نماز روزے کے احکام درج ہیں۔ اس لیے جب تک ان احکام پر بھی عمل نہ کر لیا جائے یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اتباع دین اور عمل بالقرآن کا حق ادا ہو رہا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اس جماعت کے لیے، جس نے اللہ کی کتاب پر پورا پورا عمل کرنے کا عہد کیا ہے، یہ سارے احکام بھی بالیقین اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح وہ دوسری قسم کے احکام بل کہ امر واقعی تو یہ ہے کہ اپنی بھاری اہمیتوں کی بنا پر ان میں سے اکثر احکام ایسے ہیں جو مدار ایمان اور شرط نجات ہیں۔ اس لیے وہ ایک مسلمان کے لیے اولین توجہ کے مستحق ہیں لیکن خالص دینی اور متقی حلقوں میں بھی ان پر عمل کا سراغ ملنا تو در کنار عمل کی خواہش کا وجود بھی تقریباً نایاب سا ہے۔ آج ہمارا معبود اور شہنشاہ اللہ تعالیٰ ضرور ہے مگر مسجد کی چہار دیواریاں اس کی معبودیت اور شہنشاہیت کی آخری حدیں ہیں اور مسجد سے باہر ہمارے آقا و حکمراں وہ لوگ ہیں جو ہماری ہی طرح مخلوق ہیں اور خود بھی اسی ایک آقا کی غلامی اور اسی ایک حاکم حقیقی کے قانون کی پیروی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو اللہ و رسول کے علانیہ باغی اور کفر و ضلال کے امام ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو مسلمان ہیں۔ لیکن ایسے مسلمان، جنھوں نے اللہ کے ان حقوق فرماں روائی کو جن کا تعلق دنیا میں انسانوں کی اختیاری زندگی سے ہے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ قریب قریب پوری امت مسلمہ انھی دو قسم کے "اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کو اپنا صاحب امر و حکم بنائے ہوئے ہے۔ اب اس کے لیے قانون وہ ہے جو یہ خداوندان ارضی نافذ کریں۔ نہ کہ وہ جو کتاب و سنت میں ہے۔ پھر جب انسانی زندگی کے ایسے بنیادی مسئلے میں اس امت نے پہلے مداہنت کی، اور بالآخر تعاون کی پالیسی اختیار کر لی اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ہاتھوں میں اپنے نظام سیاست کی باگیں دے کر انھی کو اپنا صاحب امر تسلیم کر لیا تو اس کے وہ بہت سے مسائل زندگی جن کا تعلق براہ راست حکومت سے ہوا کرتا ہے آپ سے آپ غیر اسلامی بنیادوں پر طے ہونے لگے۔ اب اس کے کتنے ہی اصول زندگی، اس کے سیاسی نظریات، اس کے معاشی تصورات اور اس کے عمرانی افکار کی بنیاد ہی بدل گئی، اور اس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ اور مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کا طرز ہی کچھ اور ہو گیا۔ اب وہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی غیر منقسم حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت کی داعی اور علمبردار ہے۔ اب وہ اس نظام زندگی کو جو اپنے اصول و فروع میں سر تا پا غیر اسلامی، غیر قرآنی بل کہ کافرانہ ہے نہ صرف انگیز کر رہی ہے بل کہ اس کی مشین چلانے میں مسابقت دکھا رہی ہے۔ اس کے افراد نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے نازل کردہ قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے اور

کراتے ہیں۔ حالانکہ انہیں علم ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا حکم یہ نہیں ہے۔ اب ارتداد، چوری، زنا، بہتان اور قتل کے جرائم کی سزائیں کہیں بھی وہ نہیں دی جاتیں جو کتاب و سنت میں مقرر ہیں حالانکہ انہوں نے اپنے فرماں روائے حقیقی سے عہد کیا تھا اور وفاداری کا حلف اٹھایا تھا کہ ہم ان تعزیرات کو جاری کریں گے۔ اس طرح قرآن کا ایک بڑا حصہ صرف کتابت اور تلاوت کے لیے محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اسکے ماننے والوں کی عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اگر ہمارے اندر قرآنی تعلیمات کا سچا فہم اور اسلام کی صحیح بصیرت موجود ہو، اور نفس کی چالبازیوں نے ہماری روح ایمانی کو تھپکیاں دے کر سلانہ دیا ہو تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن کے ساتھ ہم بڑی حد تک وہی سلوک کر رہے ہیں جو اہلِ کتاب نے توراۃ اور انجیل کے ساتھ کیا تھا۔ البتہ قرآن اللہ تعالیٰ کا چوں کہ آخری ہدایت نامہ تھا، جس کے باعث اس نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ کر رکھا ہے، اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ گذشتہ آسمانی کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی لفظوں کے ردوبدل اور عبارتوں کی کاٹ چھانٹ کی کوئی جسارت کامیاب ہو سکے۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی ظلم اور خیانت ایسی نہیں ہے جو دوسری امتوں نے اپنے صحیفوں کے ساتھ روا رکھی ہو اور مسلمان اس سے باز رہے ہوں عملی طور پر انہوں نے قرآن کے ایک حصے کو فراموش کر رکھا ہے۔ مراحلِ زندگی میں اس کو آگے رکھنے کے بجائے پیچھے رکھ چھوڑا ہے۔ اور "کچھ اقرار اور کچھ انکار" کی روش پر پورے اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ قدرت اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کا الزام، ایک محدود معنی ہی میں سہی، ان پر عائد نہ کرے اور پھر خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی اس پاداش کا انہیں مستحق نہ ٹھہرائے جس کا اس کا قانون مطالبہ کرتا ہے۔

تیسرا باب

چہ باید کرد؟

فرض کی پکار

اگر ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ ہماری موجودہ حالت جوں کی توں بر قرار رہے اور ہم پر خود اپنے وجود سے دشمنی کرنے والا ایک فرض ناشناس گروہ ہونے کا جو واقعی الزام لگ چکا ہے وہ نہ خلق کے سامنے سے دور ہو نہ خدا کے سامنے سے تو اس کی واحد تدبیر صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہم خود شناس بنیں، اپنا فرض یاد کریں اور پھر اس نصب العین کے ہو رہیں جس کے سوا ہمارا کوئی دوسرا نصب العین نہیں، اور نہ مسلمان ہوتے ہوئے کبھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات نہ کسی خوش عقیدگی کی پیداوار ہے نہ ماضی پرستی کا نتیجہ۔ بل کہ یہ اس کتاب کا فیصلہ ہے جسے ہم انسانی کلام نہیں بل کہ الٰہی کلام مانتے ہیں، جس کو سچی ہدایت اور یقینی علوم کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں اور جس کی ہر بات کو بلا چون وچرا تسلیم کرنے کا ہم نے عہد کیا ہے جس وقت یہ کتاب نازل ہو رہی تھی اس وقت پچھلی آسمانی کتابوں کے پیرو (یہود و نصاریٰ) کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے۔ جب اس نے ان کی اعتقادی گمراہیوں اور عملی خرابیوں پر تنقید کی اور ان کے برے انجام سے انہیں ڈرایا اور اللہ کا سچا دین پیش کر کے اس کے اتباع کی انہیں دعوت دی تو ان کی رگوں میں الٹی جاہلی حمیت بھڑک اٹھی۔ کیونکہ انہیں غرہ تھا کہ ہم خود آسمانی مذہب رکھنے والے ہیں۔ بل کہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں۔ اس لیے انہیں گوارا نہ ہو سکا کہ کوئی اور ان کے سامنے ہدایت اور امامت کا علمبردار بن کر آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جواب میں وہ جارحانہ حملوں پر اتر آئے اور ایک طرف اسلام کی تردید و تکذیب پر، دوسری طرف اپنی عظمت و امامت پر زور بیان صرف کرنے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی ان کٹھ حجتیوں کے اور ان کے اس ادعا کے جواب میں فرمایا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ. (المائدۃ : ٦٨)

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم قائم نہ کرلو تورات اور انجیل کو، اور اس چیز کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر اتری ہے۔"

یعنی تم اپنی موجودہ حالت میں رہتے ہوئے ہرگز اس امر کے مستحق نہیں ہو کہ دلیل و برہان کے ساتھ حق کے بارے میں کلام کر سکو۔ تم نے وہ بنیاد ہی کھود کر پھینک رکھی ہے جس پر تمہارے وجود ملی کی عمارت کھڑی تھی۔ اس معاملہ میں تم بحث و جدال کے حقدار اسی وقت ہو سکتے ہو جب تم ان ہدایات پر کاربند ہو جاؤ اور اپنی زندگیوں کو ان تمام احکام کا پابند بنالو جو سلطان حقیقی کی جانب سے تم پر مختلف وقتوں میں نازل ہوتے رہے ہیں۔ تم نے کتاب الٰہی کے جن حصوں کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر رکھا ہے ان کو از سرِ نو نافذ کرلو، جن صداقتوں کا تمہیں علم دیا گیا تھا ان کی حفاظت اور برملا اشاعت کا بھولا ہوا فریضہ یاد کرلو اور تمہاری زندگی کا جو مقصد ٹھہرایا گیا تھا اسے پھر اپنالو۔

اب غور کیجئے اسی فیصلۂ قرآنی کی روشنی میں خود اپنے معاملہ پر امت مسلمہ کے اتباعِ حق کی عملی حالت بھی جب یہی ہے کہ کتاب الٰہی کا ایک حصہ صرف برکت تلاوت کے لیے رہ گیا ہے اور اس سے اس کا کوئی عملی تعلق باقی نہیں رہا ہے تو انصاف کیا کہتا ہے؟ کیا اس کے سوا کچھ اور کہ اسے بھی لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ کا سزاوار ٹھہرایا جائے اور جب تک وہ "قرآن کی اقامت" نہ کرے اس وقت تک اسے شُهَدَآءَ حَقّ اور خَيْرَ اُمَّةٍ ہونے کے اعزاز کا حقدار نہ سمجھا جائے؟ یقیناً نہیں، اور بلا شبہ یہ اس کی ایک طرح کی دھاندلی ہوگی۔ اگر وہ اس اعزاز کے تمغے کو اس حالت میں بھی اپنے سینے پر آویزاں کیے رہے۔ اس لیے اگر وہ اپنے منصب اور اعزاز کی حقدار بننا چاہتی ہے تو اس کی متعین اور قطعی تدبیر صرف یہ ہے کہ وہ اپنے فرض کا بارِ گراں پھر سے اپنے کاندھوں پر اٹھالے، اور دنیا کے ہر کام ہر ہنگامے، ہر مشغولیت اور ہر دلچسپی سے منہ موڑ کر اپنی نظریں اسی ایک کام پر جمالے۔ یہ اس کے منصب اور اس کے مقصدِ وجود کا مطالبہ ہے۔ اس کے ملی تشخص کی بحالی کی اس کے سوا کوئی تدبیر ہی نہیں کہ وہ اس مطالبے کے آگے سر جھکا دے۔

ملّی نجات کی شاہراہ :

اسی طرح اس امت کے لیے دنیوی عزت واقبال کی بازیافت کی راہ بھی اس کے سوا کوئی دوسری نہیں جس کا ناقابل انکار ثبوت قرآن مجید کا وہ ارشاد ہے جو اس نے ذلت و مسکنت کے مارے ہوئے بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا تھا :۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَ كَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (المائدۃ:۶۵،۶۶)

"اگر یہ اہل کتاب ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور نعمت کے باغوں میں انہیں داخل کرتے، اور اگر وہ توراۃ اور انجیل کو اور ان ہدایتوں کو جو ان کے رب کی طرف سے انہیں پہونچی ہیں، قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی رزق بٹورتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔"

یہ تھی وہ تدبیر جس کے ذریعہ سے امت اسرائیل کو اس کا کھویا ہوا اقبال واپس مل سکتا تھا۔ اس ارشاد قرآنی کی روشنی میں امت کا معاملہ بھی کچھ مشکل نہیں رہ جاتا۔ مرض کی یکسانی چاہتی ہے کہ علاج بھی ایک ہی ہو ہلاکت ونامرادی جس راہ سے اہلِ کتاب کے یہاں آئی تھی۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ اہل قرآن کے پاس بھی اسی راہ سے آئی ہے۔ اس لیے کھلی بات ہے کہ اس سے نجات بھی اسی طریقے سے مل سکتی ہے، جس کی اہل کتاب کو تلقین کی گئی تھی۔ قرآن کہتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اسی کا کہنا ایک مومن کے لیے حرف آخر کا حکم رکھتا ہے، کہ اہل کتاب نے خداوندی احکام وہدایات کے کچھ حصوں کو چھوڑ دیا اور بھلا رکھا تھا، جس کے نتیجے میں رحمت الٰہی ان سے روٹھ گئی۔ اور غضب خداوندی ان پر ٹوٹ پڑا، جس سے نجات کی واحد تدبیر صرف یہ تھی کہ ان احکام وہدایات پر وہ پھر سے عمل کرنے لگتے۔ اب اگر کسی کے دل ودماغ قرآن حکیم کی "زبان" سمجھنے کی صلاحیتوں سے بالکل محروم نہیں ہو چکے ہیں تو اس کے لیے اس پیغام کو سمجھ لینا ذرا بھی دشوار نہیں جس کی طرف وہ اپنے اس ارشاد میں صاف طور سے انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہا ہے۔ چنانچہ جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے ہوش مندی اور عبرت کے کان دیئے ہیں، وہ قرآن کے انہی لفظوں میں سے یہ آواز بھی سن سکتا ہے کہ :۔

"اگر قرآن کے پیرو ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم انکی برائیاں ان سے

دور کر دیتے، اور نعمت کے باغوں میں انہیں داخل کرتے اور اگر وہ قرآن کو قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی رزق بٹورتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی ۔"

نیز یہ کہ :۔

"اے اہل قرآن! تم ہر گز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ قرآن کو قائم نہ کرو۔"

غرض "اقامت قرآن" دوسرے لفظوں میں اقامت دین ہی وہ واحد نسخہ شفا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے پہلے ہی سے تجویز فرمادیا تھا اور یہ بتادیا تھا کہ یہی وہ چیز ہے جس پر تمہاری اُخروی سعادت کا بھی انحصار ہے اور تمہاری دنیوی فلاح کا بھی، تم کو جب بھی ان چیزوں کی تلاش ہو، اس کے لیے راستہ یہی اختیار کرنا، باقی ہر طرف سراب ہی سراب ہو گا جہاں ٹھوکریں کھانے کے سوا تمہارے کچھ ہاتھ نہ لگ سکے گا۔ یعنی قرآن ہمیں پھر اسی مقام پر واپس جانے کا حکم دے رہا ہے جہاں سے ہم ہٹ آئے ہیں۔ حضرت امام مالکؒ نے یہ پیش گوئی نہیں کی تھی نہ اپنے کسی کشف کا اظہار کیا تھا، جب فرمایا تھا کہ :۔

لن یصلح اخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا

"یہ امت اپنے آخری دور میں بھی بہرحال اسی چیز سے خیر و صلاح پاسکے گی جس سے اس نے اپنے ابتدائی دور میں پایا تھا۔"

بل کہ یہ ایک روشن حقیقت تھی جس کا ان کی مومنانہ بصیرت نے پورے تیقن سے ادراک کیا، اور جس کے سوا کسی صاحب ایمان کے ذہن میں کوئی دوسری بات آ ہی نہیں سکتی جہاں تک "صلاح دین" کا تعلق ہے اس کے لیے تو اتباع دین کے سوا اور کوئی ذریعہ تصور ہی میں نہیں آسکتا۔ کھلی بات ہے کہ دینی سدھار دین ہی کے اپنانے سے ہو سکتا ہے۔ رہ گئی امت کی "دنیوی صلاح" تو یہ بھی اس کے شہادت حق کے منصب پر فائز جماعت ہونے کے باعثِ اسی دین ہی سے وابستہ ہے۔ کیونکہ اسے جو عروج و اقبال بھی بخشا گیا تھا وہ سب اسی نصب العین سے وفاداری کا صلہ تھا اور اس سے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے جتنے وعدے کیے تھے وہ سب اسی اقامت دین کی شرط سے مشروط تھے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی تھی کہ تم ہی سر بلند ہو گے اور تمہارے مقابلے میں تمہارے دشمنوں کا انجام محکومیت ہو گا (اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ) تو اسی کے ساتھ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ کی شرط بھی لگادی گئی تھی۔ ظاہر ہے یہ مشروط وعدہ کوئی خصوصی اور وقتی وعدہ نہیں تھا بل کہ ایک ابدی اور اصولی وعدہ تھا۔ احادیث سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ خود اس امت

کے اندر بھی خاص طور پر وہی گروہ اس کے اعزاز و اقبال کا نمائندہ اور علمبردار ہو گا جو اقامت دین کے فریضے کو پورا کر رہا ہو گا۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں :

اِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ فِیْ قُرَیْشٍ لَا یُعَادِیْهِمْ اَحَدٌ اِلَّا کَبَّهُ اللّٰهُ عَلٰی وَجْهِهٖ مَا اَقَامُوْا الدِّیْنَ.

(بخاری بحوالہ مشکوٰۃ)

بلاشبہ یہ خلافت اس وقت تک قریش ہی میں رہے گی جب تک وہ دین کو قائم رکھنے کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے جو کوئی بھی ان سے عداوت کرے گا اللہ اس کو اوندھا گرا دے گا۔"

پچھلی بحثوں کا خلاصہ :

اب تک کی تمام بحثوں سے چند اصولی نکتے نکھر کر سامنے آجاتے ہیں :۔

ایک یہ کہ اس امت کا مقصد وجود اور نصب العین اللہ کے دین کی اقامت تھا اور ہے۔

دوسرا یہ کہ اس فریضے کو انجام دینے میں اللہ تعالیٰ کی غیبی اعانتیں اس کے شامل حال رہتی ہیں اور دراصل یہی غیبی اعانتیں تھیں جن کے طفیل وہ مثالی عزت و اقبال سے سرفراز ہوئی تھی۔

تیسرا یہ کہ اس امت کے عروج و زوال کا اصل انحصار طبعی قوانین اور مادی اسباب و تدابیر پر نہیں ہے بل کہ اخلاقی قانون پر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کا عروج اپنے اس فریضے کے بجالانے پر موقوف ہے جس کے لیے وہ مبعوث کی گئی ہے۔ اور موقوف بھی اس طرح کہ اگر اس نے اس فرض سے پہلو تہی کی تو دوسری قوموں کی بہ نسبت وہ اللہ تعالیٰ کے دربار سے دوگنی سزا کی مستحق ہو گی۔

چوتھا یہ کہ اس امت کے موجودہ حالات اس بات پر صاف دلالت کرتے ہیں کہ اس نے کتاب اللہ کے ایک بڑے حصے کو عملاً چھوڑ رکھا ہے اور اقامت دین کے فریضے سے غافل ہو گئی ہے۔

پانچواں یہ کہ قرآنی فیصلے کی رو سے اس امت کے لیے فلاح اور نجات کا راستہ ہر طرف سے بند ہے ماسوا اس ایک راستے کے کہ وہ اپنے فریضہ حیات کو پہچان لے اور اللہ کے دین کو از سر نو قائم کر دینے میں تن من دھن سے لگ جائے۔ ورنہ اگر اس نے اس راہ کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرنے کی کوشش کی تو اس کی تمام تدبیریں اور کوششیں نہ صرف یہ کہ ضائع جائیں گی، بل کہ وہ اسے اس کے اپنے مقام سے اور دور پھینک دیں گی اور رہا سہا ملی وقار و اقبال بھی چھین لیں گی۔ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں دین کا سر رشتہ چھوڑ کر کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی اور اگر بظاہر کوئی سربلندی اس کو مل بھی گئی تو وہ غیروں کا عطیہ ہو گی۔ جس کا وجود بھی غیروں کے رحم و کرم پر ہو گا اور یہ بجائے خود ایک بڑی ذلت ہے۔

چوتھا باب

گریز کی راہیں

خواہش فرار کا دباؤ

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کے لیے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو، جو مسلمان جینا اور مسلمان ہی مرنا چاہتا ہو اور جس کو کل قیامت کے دن اپنے فریضۂ حیات کی جواب دہی کا پورا احساس ہو، اور جسے اس بات کا یقین ہو کہ کلام الٰہی جو کچھ فرماتا ہے، عروج وزوال اور عزت ودولت کا جو فلسفہ بتاتا ہے، وہ انسانی عقل کے گھڑے ہوئے فلسفوں کی طرح گمان اور قیاس پر مبنی نہیں ہے بل کہ اس کی بنیاد حقیقت نفس الامری پر رکھی گئی ہے۔ وہ حق ہے اور سراپا حق ہے، ایسے شخص کے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ قابلِ اختیار رہ ہی نہیں جاتی کہ ہر طرف سے اپنی آنکھیں پھیر کر، ہر آواز کے لیے اپنے کان بند کر کے، نفس کے ہر فریب اور شیطان کے ہر وسوسے سے دل کو پاک کر کے اور تمام اندیشوں سے بے پروا ہو کر صراطِ مستقیم پر اپنے قدم مضبوطی سے جمالے اور اپنے جسم ودماغ کی ساری قوتیں دین حق کے قائم کر دینے میں لگا دے۔ وہ اپنے فہم وتدبر سے کام لے کر اسکے لیے مناسب وقت تدبیریں سوچ سکتا ہے، حالات زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص طریقۂ عمل اختیار کر سکتا ہے، ماحول کے تقاضے سے کوئی مخصوص پالیسی مرتب کر سکتا ہے، لیکن یہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنے اس نصب العین اور مقصد حیات ہی میں کوئی ترمیم کر لے یا اس کو ملتوی کر دے۔ یقیناً اس طرح کی کوئی بھی کارروائی اس کے اختیار سے باہر ہے۔ وہ اس راہ سے ہٹ کر اور اس نصب العین کو چھوڑ کر جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کا اور ملی خودکشی کا قدم ہوگا۔ اس وقت اس کی مثال اس نادان اندھے کی سی ہوگی جو کسی گہرے کھڈ کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اور اس کا بہی خواہ رہنما چلا چلا کر اسے ادھر جانے سے منع کر رہا اور

صحیح راہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہو، مگر وہ ہو کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس رہنما کی باخبری، اس کی راست گوئی، اس کی خیر خواہی اور اس کے خلوص کا قصیدہ پڑھ رہا ہو اور دوسری طرف اسی سمت بڑھے جانے پر محض اس لیے اصرار بھی کر رہا ہو کہ اس سمت کی زمین اسے کچھ ڈھلوان معلوم ہو رہی ہے جس پر قدم آسانی کے ساتھ پڑتے جا رہے ہیں اور اس کی مخالف سمت کی زمین کچھ بلند دکھائی دیتی ہے جس پر قدم رکھنے میں چڑھائی کی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے بحیثیت مجموعی آج یہ امت بالکل اسی اندھے کا پارٹ ادا کر رہی ہے وہ ہر اس سمت دوڑ پڑنے کے لیے تیار ہے جس پر کسی قوم کو سرگرم سفر دیکھ پائے۔ بشرطیکہ یہ راہ اسے سہل، ہموار اور دل کش دکھائی دیتی ہو، چاہے وہ ٹھیک ہلاکت و نامرادی کی جہنم ہی تک کیوں نہ لے جاتی ہو۔ اگر کسی سمت اس کے قدم اٹھنے سے انکار کرتے ہیں تو وہی سمت ہے جو اقامت دین کی سمت کہلاتی ہے۔ اور یہ صرف اس لیے کہ یہ راہ اس کو مشکلات کے کانٹوں سے بھری ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ قرآن اس کو دوسری تمام راہوں سے روک کر اسی ایک راہ کی طرف بلاتا ہے۔ مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ہی تیرا بہی خواہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے کہ یہی ہمارا ایمان ہے وہ کہتا ہے کہ میں ہی تیرا ہادی اور نجات دہندہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے کہ اس سے کس کافر کو انکار ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی غلط بات نہیں کہتا، کبھی اپنے دعووں کی بنیاد وہم و گمان اور اٹکل پچو پر نہیں رکھتا۔ وہ جواب دیتی ہے کہ "لاریب" وہ کہتا ہے کہ میرے پاس اور صرف میرے پاس علم حقیقت ہے میں ہمیشہ صحیح راہ بتاتا ہوں، تمہاری اور ساری انسانیت کی نجات کا راز صرف میری تعلیمات میں مضمر ہے۔ وہ جواب دیتی ہے کہ "بلاشبہ"۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ میرے سوا ہے سب باطل ہے، جو کچھ میرے خلاف ہے سراسر جہل ہے، جو کچھ مجھ سے ہم آہنگ نہیں، اس میں تباہی و نامرادی کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ جواب دیتی ہے کہ یقیناً۔ لیکن جب وہ یہ کہتا ہے "کہ تیرے لیے میرے پاس صرف ایک وصیت ہے۔ "اقامت دین کی وصیت"۔ تو اس کی زبان جواب تک اس کے ہر دعوے کی تصدیق میں اتنی تیز تھی، معاً بند ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ اس کا نفس حیلوں اور تاویلوں کا لشکر تیار کر کے سامنے آجاتا ہے تاکہ اس اضطراب کو کچل ڈالے جو اس منافقانہ خاموشی کے باعث اس کی روح کی گہرائیوں میں رونما ہو چکا ہوتا ہے۔ مجرم انسان اگر اس کے اندر غیرت اور عزتِ نفس کی کوئی رمق باقی ہو، لوگوں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے آنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ اگر اس غیرت اور عزت نفس کی حس میں احساس فرض کی حرارت بھی

موجود ہوتی ہے تو وہ اسے مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے جرم کا کفارہ ادا کرے اور اپنے عمل کے ذریعے اپنے دامن سے اس داغ کو دھو ڈالے۔ اگر یہ صورت حال نہیں ہوتی اور اس کا سینہ اس حس اور اس احساس سے خالی ہوتا ہے تو پھر اس کی تمام دماغی قابلیتیں اس بات پر صرف ہونے لگتی ہیں کہ کسی طرح اس جرم کو عین حق و صواب ثابت کر دے۔ اس وقت اس کا نفس اسے بے گناہی کا فریب دینے میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے حکم سے اس کا دماغ تاویلوں کی ایک خوش نما نقاب تیار کر دیتا ہے، جس کو وہ اپنے چہرے پر ڈال کر اپنے آپ کو یہ محسوس کرا لیتا ہے کہ میں بر سر غلط قطعاً نہیں ہوں۔ اس کے بعد اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کو بھی ایسا ہی محسوس کرا دے تاکہ اس کے داغ گناہ کی طرف کوئی انگلی اٹھانے والا نہ رہ جائے۔ ٹھیک یہی حال ہے اپنے فریضۂ ملی اور مقصد زندگی کی بجا آوری میں امت مسلمہ کا۔ وہ اپنے فرض کے چھوڑ بیٹھنے پر کچھ اسی قسم کے ادعائے بے گناہی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ صدیوں کے انحطاط اور زوال نے اس کے احساس فرض کو بری طرح کچل کر رکھ دیا ہے اور ان بلند جذبات سے اس کا سینہ تقریباً اجڑ گیا ہے جو کسی نصب العین کی بجا آوری کے لیے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ خصوصاً اقامت دین کے نصب العین کے لیے، جو کبھی بھی آسان نہ تھا اور جس میں جان و مال کی بازی، عیش و آرام کی قربانی اور امیدوں اور تمناؤں کی پامالی شرط اول قدم ہے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر کے تلافی کی کوشش کرتی اور اپنے منصب کو سنبھال لیتی، سرے سے اپنی کوئی ذمہ داری ہی نہیں تسلیم کرنا چاہتی، بل کہ طرح طرح کی دور از کار تاویلوں سے اپنے رہے سہے احساس کو بھی دباتی جا رہی ہے۔ یہ تاویلیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں اور مختلف لوگ ادائے فرض کے مطالبے پر جواب میں مختلف معذرتیں پیش کرتے ہیں۔ چوں کہ یہی تاویلیں اور یہی معذرتیں، دوسرے لفظوں میں فرار اور گریز کے یہی "فلسفے" امت کے ۹۹ فیصد سے زیادہ افراد کے لیے حجاب نظر بنے ہوئے ہیں، اور جب تک ان کی بے حقیقتی واضح نہیں کر دی جاتی ان کا اپنے فرض کی طرف پلٹ آنا محال سا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ان کا جائزہ لیا جائے اور پھر ان پر تنقید کر کے بتا دیا جائے کہ فی الواقع ان کی کیا قدر و قیمت ہے؟

گریز کے "فلسفے"

جہاں تک عام جائزے کا تعلق ہے یہ تاویلیں یا گریز کے یہ "فلسفے" پانچ ہیں:۔

ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ عمل کرنے والے کے لیے کسی حال میں بھی اپنی واقعی

ذمہ دا۔یوں سے عہدہ بر آ ہو جانے کی راہ بند نہیں۔ چنانچہ جن کو اللہ تعالیٰ نے حسن عمل اور خشیت و انابت کی توفیق بخشی ہے وہ آج بھی دین پر ٹھیک عامل ہیں۔ اپنے فریضے کو انجام دے رہے ہیں، دین کی اقامت کر رہے ہیں، حق کی شہادت دے رہے ہیں اور امر بالمعروف کرتے رہتے ہیں۔ رہ گئے قرآن و سنت کے اس طرح کے اجتماعی احکام، جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے تو ان کا تعلق اسلامی حکومت سے ہے۔ اور ان کے مخاطب مسلمانوں کے اولوالامر ہیں، عوام نہیں اس وقت چوں کہ اسلامی حکومت قائم نہیں ہے اس لیے ان احکام کے اجرا و نفاذ کی ذمہ داریوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر کچھ احکام ایسے ہیں بھی جن کا تعلق برہ راست عام افراد سے ہے لیکن جن پر عمل نہیں ہو رہا ہے، مثلاً غیر اسلامی عدالتوں سے معاملات کا فیصلہ نہ کرانا اور غیر اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے نہ کرنا وغیرہ تو ایسا وہ اضطراراً کر رہے ہیں اور یہ شریعت کا ایک عام اصول ہے کہ اضطرار کے وقت ناجائز کام بھی مباح ہو جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن کے ایک حصے کو چھوڑ بیٹھنے اور اقامت دین کا فریضہ بھول جانے کا عمومی الزام صحیح نہیں ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلاشبہ ملت اسلامیہ کا مقصد وجود یہی اقامت دین ہی ہے۔ لیکن موجودہ ناسازگار حالات میں اس نصب العین کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا اس وقت اس کی خاطر جدوجہد کرنا وقت اور قوت کو ضائع کرنا ہے، اور دنیا کے سامنے اسے علانیہ پیش کرنا نہ صرف مصلحت کے خلاف اور ناعاقبت اندیشی کی دلیل ہے بل کہ مفاد ملت کے لیے سراسر مضر اور مہلک بھی ہے۔ اس لیے سردست خدمت دین کی کچھ ایسی جزئی تدبیریں اختیار کی جانی چاہئیں جو ممکن العمل ہوں اور تجربہ سے دین کے احیاء میں مفید ثابت ہو چکی ہوں اور آگے چل کر ہمارے اس نصب العین کے لیے حالات کو نسبتاً کچھ زیادہ سازگار بنا دینے والی ہوں۔ پھر جب یہ آج کے حالات بدل جائیں گے اور ہمارے اس مشن کے لیے وہ اتنے ناسازگار نہ رہ جائیں گے جتنے کہ اب ہیں، اس وقت اس کے لیے براہ راست جدوجہد شروع کی جائے گی۔

تیسرے گروہ کا اندازِ فکر یہ ہے کہ اس نصب العین کے برحق ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر اس کے لیے صدیق اور فاروق درکار ہیں۔ ہم ایسے بن نہیں سکتے، اس لیے ہمارے بس کا یہ کام ہی نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی، اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمانوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گذر چکا۔

چوتھا گروہ یوں سوچتا ہے کہ کام کی کوئی راہ کھلے اور کوئی قافلہ اس پر کامیاب گام زنی کا مظاہرہ کر لے تو ہم بھی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ گویا کسی جدوجہد کا شروع ہو جانا بھی ان کے لیے اقدام کو ضروری نہیں ٹھہرا سکتا۔ بل کہ یہ اقدام ان کے لیے صرف اس وقت ضروری ہوگا جب کہ کچھ لوگ آگے چلنے والے انہیں نظر آجائیں اور وہ مضبوطی اور ثابت قدمی دکھا کر ایک حد تک راستے کو صاف بھی کر دیں، جب تک ایسا نہیں ہو جاتا ان کے لیے اس جدوجہد میں شریک ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو حضرت امام مہدی کے آنے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ اس گروہ کو اگرچہ اس نصب العین کے برحق ہونے سے اختلاف نہیں۔ مگر اس کے سوچنے کا انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے امام مہدی کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے اور انہی کی زیر سر کردگی یہ مہم چلائی جائے گی۔ ان کی آمد سے پہلے اس کام کی عام امت پر کوئی خاص ذمہ داری ہے ہی نہیں۔ اس لیے ہم کو خواہ مخواہ یہ دردسر نہیں خریدنا چاہیے۔

یہ سارے گروہ اور ان کے یہ خیالات مسلمانوں کے ان حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی اور دیندار حلقے کہے جاتے ہیں۔ رہ گئے وہ لوگ جو دین کے قلادے کو اپنی گردن سے عملاً اتار کر پھینک چکے ہیں اور جو اپنے مسائل زندگی میں قرآن وسنت کو اتھارٹی تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں، تو ان کے خیالات سے تعرض کرنا فضول ہے۔ کیونکہ وہ اس بات کے حقدار ہی نہیں کہ اس بحث میں ان کی باتوں کو بھی کوئی جگہ دی جائے، بل کہ وہ شاید خود بھی اسے پسند نہ کریں۔

اب آیئے ترتیب وار ہر گروہ کے خیالات کو دلائل کی میزان میں تول کر دیکھیں تاکہ ان کا صحیح وزن معلوم ہو سکے، اور یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ آیا ان تاویلوں میں سے کوئی ایک تاویل بھی ایسی ہے جس سے واقعتاً ہماری ذمہ داری اور مسئولیت کچھ ہلکی ہو جاتی ہو۔

(۱) دین کے جزوی اتباع پر اطمینان

پورے مجموعۂ شریعت کی پیروی کا وجوب:

اس امر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن و سنت میں صرف نماز، روزے اور حج و زکوٰۃ ہی کے فرائض کا ذکر ہے اور مومن سے صرف انہی احکام کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ کہنے کی بھی کوئی جسارت نہیں کر سکتا کہ عبادات اور اخلاق کے ماسوا جو احکام ہیں وہ (نعوذ باللہ) محض بھرتی کے مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کتاب و سنت میں جو احکام ہیں وہ بندگی کا ایک جامع نظام اور زندگی کا ایک جامع ضابطہ ہیں، اور ان کا ایک ایک جزو اتباع اور عمل ہی کے لیے ہے۔ آپ ان میں علمی طور پر جو فرق مراتب چاہیں کر لیں اور ان کے اجر و ثواب میں بھی باہم جو نسبت چاہیں متعین کر لیں، لیکن عملی طور پر کسی تفریق کے نہ آپ حقدار ہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ ایک غلام کا فرض اپنے آقا کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل ہے۔ اس کو یہ حق کبھی نہیں پہونچتا کہ ضروری اور غیر ضروری بحثیں پیدا کر کے بعض حکموں کو تو مانے اور بعض سے بے رخی برت جائے۔ آقا کا حکم بہر حال حکم ہے جسے ہر صورت میں پورا ہونا چاہیے۔ مسلمان نے بھی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور ہمہ وقتی غلامی کا عہد کیا ہے۔ اب اگر (بطور مثال) اس آقا کی طرف سے اس کے پاس یہ دو حکم آتے ہیں:

ایک تو یہ کہ نماز پڑھو، دوسرا یہ کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو، تو اس کا فرض ہے کہ وہ یکساں توجہ کے ساتھ ان دونوں حکموں پر عمل کرے اس لیے اگر وہ ان میں سے صرف پہلے حکم پر عمل کرتا ہے اور دوسرے کو سن کر خاموش ہو رہتا ہے تو کون ہے جو اس کے اس طرز عمل کو اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور اس کی کتاب الاحکام۔ قرآن۔ کی پوری پابندی قرار دے سکے؟ پھر یہ کیا ستم ہے کہ قرآن کے ایک دو نہیں بیسیوں احکام معطل ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر بھی ہمیں خوش فہمی ہے کہ ہم اتباعِ دین کے مطالبے سے پوری طرح عہدہ بر آ ہو رہے ہیں۔

سیاسی اقتدار سے محرومی کا عذر:

رہا یہ عذر کہ ہم تو ان احکام کے سرے سے مکلّف اور مخاطب ہی نہیں، ان کے نفاذ کی ذمہ داری تو مسلمانوں کے اولو الامر پر ہے۔ آج چونکہ اسلامی حکومت موجود نہیں اس لیے ان احکام کے نافذ کرنے کا سوال ہی باقی نہیں رہ گیا ہے اور اس وقت یہ ذمہ داری ہی ساقط ہے، تو یہ کھلا ہوا عذرِ گناہ ہے، اور ایسا عذر گناہ ہے جو خود اس گناہ سے بھی بدتر ہے۔ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے مسلمانوں کے اولوالامر! تم چور کے ہاتھ کاٹ دو یا یہ کہ اے اسلامی حکومت کے ذمہ دارو! تم زانی کے کوڑے مارو۔ بل کہ اس طرح کے قوانین کا اور ان کے نفاذ کا جب وہ حکم دیتا ہے، تو مخاطب پوری امت کو بناتا ہے۔ مثلاً آیت سرقہ ہی کو لے لیجیے جس کے الفاظ یہ ہیں:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا (المائدۃ۔۳۸)

چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔

ان لفظوں کے اندر اگرچہ یہ صراحت نہیں ہے کہ خطاب اس حکم کا کن سے ہے؟ مگر دو وجوہ یہاں ایسے موجود ہیں جن کے باعث بنیادی طور پر اس حکم کا مخاطب اہل ایمان کا پورا گروہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک[1] تو یہ اصول کہ جب تک کسی حکم کے بارے میں یہ صراحت نہ ہو یا کوئی زبردست قرینہ نہ موجود ہو کہ یہ حکم فلاں خاص شخص یا خاص گروہ کے لیے ہے، اس وقت تک اس کو سارے اہل ایمان کے لیے عام سمجھا جائے گا۔ دوسری[2] یہ بات کہ اس آیت سے تین آیتیں پہلے جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: کہہ کر، یعنی تمام اہل ایمان کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے، درمیان کی دو آیتوں میں کفار کے انجام بد کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد ہی یہ آیت سرقہ ارشاد ہوئی ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب سے جو کچھ یہاں فرمایا گیا ہے، ہاتھ کاٹنے کا یہ حکم بھی اسی کے اندر شامل ہے اور اس کا مخاطب نہ کوئی خاص فرد ہے نہ مسلمانوں میں کا کوئی خاص گروہ، بل کہ سارے مسلمان ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن جریر طبریؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

یقول جل ثناء ہ من سرق من رجل اوامراۃ فاقطعوا ایھاالناس یدہ ....فلا تفرطواایھا المومنون فی اقامۃ حکمی علی السراق وغیرھم من اھل الجرائم الذین اوجبت علیھم حدودا فی الدنیا.

(تفسیر ابن جریر: جلد ص ۱۳۳)

"اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ اے لوگو! جو مرد یا عورت چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو۔ اے مسلمانو! چوروں اور ان تمام مجرموں پر، جن کے لیے میں نے دنیا میں سزائیں مقرر کردی ہیں، میرے احکام جاری کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنا۔"

غور سے دیکھئے ایک جگہ "فاقطعوا" کے مخاطب حقیقی کی تشریح علامہ نے "ایھاالناس" کے لفظ سے کی ہے اور دوسری جگہ "ایھاالمومنون" کے لفظ سے "یااولی الامر" کہیں نہیں فرمایا۔ یہی نہیں بل کہ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کردی کہ مخاطبت کا یہ عموم صرف اسی آیت سرقہ تک محدود نہیں ہے، بل کہ تمام کے تمام تعزیراتی احکام کا حال یہی ہے اور ان سب میں بنیادی خطاب

سارے اہل ایمان کی طرف ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان احکام کے نفاذ کی اصل ذمہ داری پوری امت پر ہے، اس لیے یہ عذر کہ چوں کہ ان احکام کے مخاطب اولوالامر ہیں، اس لیے امت کے عام افراد کی ان کے سلسلے میں کوئی مسؤلیت ہے ہی نہیں، ایک واہی عذر ہے اور کسی طرح بھی قابل تسلیم نہیں ہے۔

البتہ اس سلسلے میں ایک بات ضرور صحیح ہے، صرف صحیح ہی نہیں بل کہ قطعاً ضروری بھی ہے اور وہ یہ کہ ان قوانین کا اجراء اولوالامر ہی کے ذریعہ ہوگا۔ کیونکہ نظم مملکت کا تقاضا یہی چاہتا ہے۔ ورنہ معاشرے میں افراتفری پھیل جائے گی اور کوئی اجتماعی نظام باقی ہی نہیں رہ سکے گا۔ حالانکہ اسلام سے بڑھ کر نظم وانضباط کا اور کوئی خواہاں نہیں۔

اب جب کہ دو باتیں اپنی اپنی جگہ ثابت شدہ اور مسلم ہو چکیں:۔

ایک تو یہ اجتماعی احکام کی اصل مخاطب اور ذمہ دار پوری امت ہے، اور دوسری یہ کہ ان کا بالفعل نفاذ صرف اولوالامر کرتے ہیں، تو ان دونوں مسلّم باتوں کا متفقہ مطلب یہ ہے کہ یہ اولوالامر ان احکام کا اجراء ونفاذ پوری امت کی طرف سے اور اس کی نیابت میں کرتے ہیں۔ نہ کہ اصل مخاطب اور ذمہ دار کی حیثیت سے۔ اس حقیقت واقعی کے پیش نظر ایسی حالت میں جب کہ یہ نیابت کرنے والے کسی وجہ سے موجود نہ ہوں یا موجود ہوں مگر وہ اپنا یہ فرض ادا نہ کر رہے ہوں، اس ذمہ داری کا رخ لازماً آپ سے آپ اصل مخاطب، یعنی پوری امت کی طرف ہو جائے گا۔ اور اس کے لیے یہ ضروری ہو جائے گا کہ اگر اولوالامر موجود نہ ہوں تو وہ ان کا تقرر کرے۔ اور اگر موجود ہوتے ہوئے وہ ان احکام کو نافذ نہ کر رہے ہوں تو وہ انہیں اس کے لیے مجبور کرے، یا انہیں ہٹا کر دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ پر لائے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ان احکام کی نوعیت فرض کفایہ کی سی ہے۔ اگر اولوالامر کے گروہ نے ان کی تعمیل کر دی تو پوری امت کے سر سے یہ فرض اتر جاتا ہے، بصورت دیگر یہ ایک اجتماعی گناہ ہوگا جس کا وبال پوری امت پر رہے گا۔

یہاں پہونچ کر ایک اور سوال بھی کیا جائے گا۔ اور وہ یہ کہ ہمارے پاس وہ سیاسی اقتدار کہاں ہے، جو ان احکام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے اور جس کی موجودگی ہی میں امت اپنے اندر سے اولوالامر کا تقرر کر سکتی ہے اور پھر ان کے ذریعہ اپنے اس فریضہ سے عہدہ بر آ ہو سکتی ہے؟ یقیناً یہ ایک سنجیدہ سوال ہے۔ اور اس بات سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ ایسے احکام کے نفاذ کی اصل ذمہ دار اور مخاطب اگرچہ پوری جماعت ہے مگر عملاً ان کا نفاذ ایک قوت قاہرہ یعنی اقتدار حکومت ہی

کی موجودگی میں ہوگا۔ اس اقتدار کے بغیر ان احکام کا جاری کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس لیے اس کام کے لیے یا یوں کہئے کہ قرآن کے ایک بڑے حصے پر عمل کے لیے سیاسی اقتدار کا وجود ضروری ہے۔ لیکن اس سوال کے سلسلے میں سوچنے کی بات کیا ہے؟ آیا یہ کہ سیاسی اقتدار کے نہ ہونے کی صورت میں ہماری اور آپ کی ذمہ داریوں میں کمی آجاتی ہے؟ یا یہ کہ وہ اور زیادہ سخت اور گراں ہو جاتی ہیں؟ آیا ہم کو خدا کا شکر ادا کر کے اس بات پر اطمینان کا سانس لینا چاہیے کہ چلو قرآن کے ایک حصے پر عمل کرنے سے آزادی مل گئی؟ یا اس اقتدار کے حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے پروردگار کے کتنے ہی احکام پر عمل پیرا ہونے کی سعادت سے محروم ہیں؟ نہ صرف یہ کہ سعادت سے محروم ہیں بل کہ اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے، اور کتاب الٰہی کو چھوڑ بیٹھنے اور بھول جانے کی قدیم سنت ضلال دہرانی پڑ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے دماغ کو منطقیانہ قیل و قال سے پاک کر کے، کان، اپنے قلب و ضمیر کی آواز پر لگا لیجیے اور سنئے کہ وہ ان سوالوں کا کیا جواب دے رہے ہیں؟ یقین جانئے جس قلب میں بھی ایمان کی حرارت موجود ہوگی وہ کبھی سکون اور اطمینان کے ساتھ اس صورت حال کو برداشت کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ اس لیے ان احکام کو نافذ کرنے والی قوت کے موجود ہونے کی شکل میں اگر امت پر صرف یہ ایک فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ ان کو نافذ کرائے تو اس کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس پر دو فرض عائد ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پہلے وہ اس قوت کو حاصل کرے۔ دوسرا یہ کہ قوت حاصل ہو چکنے پر ان احکام کو نافذ کرائے کیونکہ یہ ایک مانا ہوا اصول ہے کہ جس چیز پر کسی فرض کی ادائیگی موقوف ہوتی ہے اس کا حاصل کرنا خود فرض ہو جاتا ہے۔ آپ اس شخص کو ملامت کرنے میں شاید ایک لحہ بھی توقف نہ کریں گے جو نماز اس عذر سے نہیں پڑھتا کہ اسے قرآن یاد نہیں یا جانماز ناپاک ہے، اور اس پر یہی الزام لگائیں گے کہ یہ اپنے فرض سے جی چرا رہا ہے۔ اس کے دل میں نماز کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ محبت، ورنہ ایسا عذر لنگ نہ کرتا، اور دنیا کے سارے کاروبار چھوڑ کر سب سے پہلے قرآن یاد کرنے کی کوشش میں یا جانماز پاک کرنے کی تدبیر میں لگ جاتا۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان آج قرآنی احکام کے ایک بڑے حصے کو معطل کر کے صرف اس لیے مطمئن بنا بیٹھا ہے کہ ان پر عمل کرنے کے لیے جس اقتدار کی ضرورت ہے وہ میسر نہیں اور اس جھوٹے اطمینان پر اس کی مومنانہ حس کو ذرا ٹھیس نہیں لگتی اور نہ اس کے تقویٰ پر اس کی نگہ احتساب کوئی حرف رکھتی، نہ اسے اپنا یہ عذر، عذر لنگ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ذرا نہیں

سوچتا کہ اگر یہ اقتدار اسے میسر نہیں تو یہ اس کا اولین فرض ہے کہ اپنی ساری قوتیں اور تدبیریں صرف کر کے اسے حاصل کر لے۔

بلاشبہ یہ ایک بڑا دشوار کام ہے اور یہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے لیے ساری طاقت نچوڑ نہ دی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مومن کی طاقت خواہ وہ ذہنی اور دماغی ہو، خواہ جسمانی، مالی ہو خواہ جانی، ہے کس کام کے لیے؟ آخر اس کے دل و جان کی قوتیں اور اس کی جان و مال اس کی اپنی ملکیت تو ہیں نہیں کہ انہیں سینت کر رکھے رہے بل کہ جس روز اس نے ایمان کا اقرار کیا تھا اسی روز یہ چیزیں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی رضا کے عوض بیچ چکا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ. (التوبة:۱۱۱)

"اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔"

اس خرید و فروخت کے ہو جانے کے بعد ان چیزوں کی حیثیت اب اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتی کہ وہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت کے طور پر رکھی ہوئی ہیں۔ "امانت" کے بارے میں یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ جب بھی اس کا مالک اسے طلب کرے بے چون وچرا اس کے حوالے کر دینا امانت دار کا فرض ہے، اس لیے جب تک کوئی مومن اپنے مومن ہونے سے انکار نہیں کرتا اس کا یہ فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے پاس رکھی ہوئی اپنی امانت جب اور جس طرح طلب کرے وہ اسی وقت اور اسی طرح اسے لا کر حاضر کر دے۔ یہ بات کہ اپنی یہ امانت اس نے اپنے مومن بندے کے پاس کس لیے رکھ چھوڑی ہے؟ اس کی کتاب ہی بتا سکتی ہے۔ یہ کتاب کہتی ہے کہ:۔

وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (التوبة:۴۱)

"اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔"

بات بالکل واضح ہو گئی، یعنی یہ کہ وہ چیز جس پر مومن کی جان و مال خرچ ہونے کے لیے ہے، "اللہ کی راہ" دوسرے لفظوں میں اس کا دین ہے۔ اس لیے وہ اپنے فرض بندگی سے سبکدوش اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی شکل میں کہ ان چیزوں کو "اللہ کی راہ" میں نثار کرنے سے دریغ نہ کرے۔ ورنہ جو چیز خدا کی خریدی ہوئی اور ہمارے پاس بطور امانت رکھی ہوئی ہے اسے عندالمطالبہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا کوئی معمولی جرم نہ ہو گا، بل کہ بدترین قسم کی خیانت اور کمینہ پن ہو گا اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شخص اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کر رہا ہے جس کے پاس خدا نے اپنی چند امانتیں اس لیے رکھ چھوڑی ہیں کہ جب اس کی اطاعت امر کی راہ میں کوئی مانع پیش آئے تو وہ

ان کے ذریعہ اس مانع کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے، لیکن اسکا حال یہ ہو کہ موانع پیش آنے کی صورت میں بجائے اسکے کہ وہ ان امانتوں سے کام لے کر انہیں دور کرے، کرتا یہ ہے کہ موانع کا عذر کر کے اس حکم ہی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتا ہے اور پھر اطمینان کے ساتھ ان امانتوں کو غاصبانہ طور پر اپنی خواہشوں کی چاکری میں لگائے رکھتا ہے۔

اضطرار کا عذر:

یہ عذر لنگ تو ان احکام کے سلسلے میں تھا جن پر غیر اسلامی اقتدارِ بالا کی موجودگی میں عمل فی الواقع نہیں ہو سکتا۔ اب رہ گئے بعض وہ احکام دین جن پر عمل کرنے سے یہ اقتدار کفر بھی مانع نہیں ہے لیکن پھر بھی انہیں چھوڑ رکھا گیا ہے، تو ان کے سلسلے میں یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ایسا اضطراراً ہو رہا ہے اور اضطرار کی حالت میں حرام بھی جائز ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ عذر بھی پہلے عذر ہی جیسا بے وزن عذر ہے اور یہ کہ اس طرح کی بات یا تو اپنی عام اجتماعی ذہنیت کے غلط مطالعے کی بنا پر کہی جا سکتی ہے یا پھر رخصت اضطرار کی ضروری حدود اور شرائط سے انتہائی ناواقفیت کی بنا پر۔ چنانچہ آیئے جس قانون اضطرار کی آڑ لی جاتی ہے، اس کے الفاظ دیکھئے:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (البقرة:۱۷۳)

"البتہ جو شخص مجبور ہو جائے (اور بحالت مجبوری حرام کھا کر اپنی جان بچالے) اس حال میں کہ (اس حرام شئے کے کھانیکی) نہ تو وہ کوئی رغبت رکھتا ہو اور نہ (ناگزیر مقدار سے) تجاوز کرتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یقیناً اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ یہ الفاظ ایک حرام شے کے استعمال کی رخصت دیتے ہیں۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ یہ رخصت بلاقید و شرط نہیں ہے۔ بل کہ وہ اس کے لیے تین تین شرطیں بھی عائد کرتے ہیں، اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان میں سے ایک ایک شرط کا پورا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔

ان میں سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ حالت واقعی مجبوری کی ہو اور کسب حلال کی تمام تدبیریں اس حد تک بے کار ہو چکی ہوں کہ بس لقمۂ حرام کے سوا اب جان بچانے کا کوئی ممکن ذریعہ باقی ہی نہ رہ گیا ہے۔

دوسری شرط ہے کہ حرام کا یہ استعمال "غَيْرَ بَاغٍ" ہو۔ یعنی دل میں اس کی کوئی رغبت نہ

ہو۔ بل کہ اس کا استعمال کیا جائے تو پورے احساس ناگواری اور شدید جذبۂ کراہت کے ساتھ کیا جائے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ حرام کا یہ استعمال بھی بس اسی حد تک کیا جائے جس حد تک کہ جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔

اگر ان تینوں شرطوں کے ساتھ کوئی شخص ایک ناجائز شئے کا استعمال کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی پکڑ نہ ہو گی۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری ہونے سے رہ گئی۔ تو پھر اس رخصت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اور اگر کوئی اس شکل میں بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو یہ اس کی کھلی ہوئی دھاندلی ہو گی اور اسے اللہ تعالیٰ کے حضور اس کا خمیازہ لازماً بھگتنا پڑے گا۔

اسلامی قانون اضطرار کی وضاحت آپ کے سامنے آچکی۔ اب اس کی روشنی میں اپنے اجتماعی طرز عمل کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیجئے۔ اور پھر اپنی ملت کے ان خدا پرستوں کی تعداد بتایئے جو اقتدار باطل کے زیر سایہ زندگی بسر کر کے "مسرفین" کی اطاعت کرنے، لادین اسمبلیوں میں جاکر قانون ساز بننے، غیر اسلامی عدالتوں میں اپنے معاملات لے جانے اور طاغوتی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں وہی مجبوری، وہی ناگواری ——— اور وہی کراہت محسوس کرتے ہوں جو ایک مومن کو سور کی بوٹی حلق سے نیچے اتارنے میں محسوس ہو سکتی ہے۔ کیا کروڑوں انسانوں کا یہ بھاری انبوہ غیر اللہ کی حاکمیت اور مسرفین کی اطاعت کو حقیقتاً اسی اضطرار کے ساتھ برداشت کر رہا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے؟ کیا مسلمانوں کے یہ گروہ، جو صبح سے شام تک طاغوتی عدالتوں کا طواف کیا کرتے ہیں، یہ سب اپنے اس فعل کو اصلاً حرام ہی سمجھتے اور اس کو محض انتہائی مجبوری کے وقت ہی اختیار کرتے ہیں؟ اور ان میں اپنی اغراض نفس کی پیروی، حدود اللہ سے بے اعتنائی اور احکام شریعت سے سر تابی کا کوئی داعیہ کار فرما نہیں ہوتا؟ کیا وہاں وہ فی الواقع صرف اس لیے جاتے ہیں کہ انہیں اپنی جان و مال کی حفاظت کا کوئی امکانی راستہ باوجود جستجو کے نہیں ملتا؟ کیا یہ جج اور مجسٹریٹ صاحبان جو اپنی زندگیاں غیر اسلامی آئین و قانون کے مطابق داد انصاف دینے میں گذار دیتے ہیں۔ در حقیقت "مخمصہ" (فقر و فاقہ) ہی کے شکار ہوتے ہیں اور اپنی اسی مجبوری کی بنا پر اپنے اس مشغلے کو گوارا کرتے ہیں؟ کیا جس وقت وہ اللہ جل مجدہ کے قوانین پس پشت ڈال کر خدا ناشناس انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں اس وقت ان کا دل اس فعل کی برائی کا کوئی احساس رکھتا ہوتا ہے اور اپنی اس حالت پر کڑھ رہا ہوتا ہے؟ کیا وہ یہ کام بالکل

غَیْرَ بَاغٍ وَّلاَ عَادٍ ہو کر انجام دیتے ہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں نہیں ہے تو یقیناً یہ سب لوگ فَلاَ اِثْمَ عَلَیْہِ کی رخصت اور رعایت کے مستحق ہیں۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ مگر حقائق کا کیا کیا جائے کہ وہ ہماری اس خواہش سے ایک فیصدی بھی موافقت نہیں کرتے۔ اگر خود احتسابی کی جرأت سے کام لے کر حقیقتِ حال کا جائزہ لیجئے تو مشاہدہ آپ کو یہ ماننے پر مجبور کردے گا کہ ان عدالتوں میں جاتے وقت، یا ان کی کرسیوں پر بیٹھتے وقت شرط اضطرار کی ضرورت کا عموماً تصور تک نہیں پیدا ہوتا۔ ان کرسیوں تک وہ مسلمان پہونچتا ہی کب ہے جو فقر و فاقہ کے ہاتھوں مجبور ہو اور جس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار رہ ہی نہ گیا ہو کہ بقائے حیات کی خاطر یہ رزق خبیث قبول کرلے۔ ان جگہوں تک پہونچ ہی وہ لوگ پاتے ہیں جو پہلے ہی سے آسودہ حال ہوتے ہیں یا کم از کم اس انتہائی قسم کے افلاس میں مبتلا نہیں ہوتے جس کو مخمصہ کہا جاسکے۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سب کچھ نہایت ٹھنڈے دل سے شوق اور رغبت کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ اولاد کو تعلیم دے کر تیار ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ ان کرسیوں تک پہونچ جائیں، اور جو پہونچ جاتا ہے وہ ترقیٔ درجات کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ حالانکہ اگر واقعۃً اضطراری حالت ہی کی وجہ سے کوئی یہ ذریعہ معاش اختیار کئے ہوتا تو اس کے ایمان کا فطری تقاضا یہ تھا کہ اس پر ہرگز مطمئن نہ ہوتا۔ اور اسے چھوڑ کر کوئی جائز ذریعۂ معاش پالینے کے لیے بے چین رہتا۔ مگر ایسے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی شاید نہ مل سکیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھلی ہوئی طاغوت نوازی کو اضطرار کا نام کس طرح دیا جاسکتا ہے؟ اسی طرح اگر فی الحقیقت ہم غیر اللہ کی حاکمیت کے دل سے منکر ہوتے اور ہماری غیرت ایمانی اس سے متنفر ہوتی تو ہم یوں گھروں کے عیش اور مدرسوں کی قیل و قال اور حجروں کی ہائے ہو میں سکون کے ساتھ مشغول نہ رہتے، اگر ہم سے کچھ نہ بن پڑتا تو کم سے کم یہ تو کرتے ہی کہ اس "منکرا عظم" کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہ کرتے اور نہ اس کے سلسلے میں کسی اعتقادی اور قولی مداہنت کے روادار ہوتے۔ اس کے بخلاف ہوتا یہ کہ ہم اپنی زبان کی پوری قوت سے اس کی کھلی مخالفت کرتے، اور اگر یہ بھی نہ ہوسکتا تو اس سے دلی نفرت تو بہر حال رکھتے ہی۔ کیونکہ رسول خدا ﷺ کے ارشاد کے مطابق یہ ایمان کی آخری حد ہے، آپؐ برائیوں اور برے لوگوں کے سلسلے میں اہل ایمان کا رویہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

مَنْ جَاھَدَھُمْ بِیَدِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِلِسَانِہٖ فَھُوَمُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِقَلْبِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ لَیْسَ وَرَاءَ ذَالِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ۔

"جس نے ان سے اپنے ہاتھ کے ذریعہ جہاد کیا وہ مومن ہے۔ جس نے اپنی زبان کے ذریعہ جہاد کیا وہ (بھی) مومن ہے، جس نے اپنے دل کے ذریعہ جہاد کیا وہ (بھی) مومن ہے، اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان (متصور) نہیں۔ (مسلم: جلد اول)"

مگر یہاں حال یہ ہے کہ اتنی بڑی برائی سے کسی نفرت اور کراہت کی ضرورت کا سوال تو الگ رہا، اسے برا سمجھنا بھی چھوڑ دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب اس کے قیام کے لیے حلف وفاداری اٹھا لینے میں بھی کوئی مضائقہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اور اس کی بقا کے لیے علانیہ جسم ودماغ کی ساری قوتیں نثار کی جارہی ہیں۔ کیا ایک قابل نفرت شئے سے یہی برتاؤ کیا جانا چاہیے۔ ایسی کھلی ہوئی برائیوں کے بارے میں بھی اگر ایمان کے اس کم سے کم تقاضے کا اظہار نہ ہو سکا جس کی حدیث مذکور میں وضاحت کی گئی ہے تو پھر ایسے ایمان کو زندہ ایمان کیسے کہا جاسکتا ہے؟ آخر اضطرار کی بھی تو کوئی حد ہونی چاہیے۔ اگر اس کے دامن کو اتنی وسعت دے دی جائے، جتنی کہ ہمارے عام رویہ سے ظاہر ہو رہی ہے، تو یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی برائی اور قرآن کی کوئی قانون شکنی بھی اس کے دائرے سے باہر نہیں رہ سکتی۔ ایسی حالت میں تو ایک "مسلمان" اپنے نفس کی پیروی اسی آزادی سے کرتا رہے گا جس آزادی سے خدا کے منکر کیا کرتے ہیں۔ اور اخلاق وخدا پرستی کے وہ سارے اصول وضوابط بیکار ہو کر رہ جائیں گے جن کی تعلیم کے لیے قرآن کو اتارا اور صاحبِ قرآن کو بھیجا گیا تھا۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اضطرار کا یہ وہ من مانا مفہوم ہے جس سے اللہ اور رسول بالکل بری ہیں۔

ہم اس پستی تک جس طرح پہونچے ہیں اسے بھی سمجھ لینا چاہیے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ایک برائی کسی سوسائٹی میں پہلے پہل نمودار ہوتی ہے تو سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اس پر نفرت اور ملامت کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ لیکن اس نفرت اور ملامت کا جذبہ اگر قوی اور عام ہوتا ہے تب تو وہ برائی دب جاتی ہے، ورنہ وہ جڑیں پکڑنے لگتی اور آہستہ آہستہ برگ وبار لانے لگتی ہے، اب اگر اس سوسائٹی کے خیر پسند لوگ بھی اپنے امکان بھر اس کی جڑیں اکھیڑنے کی کوشش میں برابر لگے نہ رہیں اور اس کے خلاف صرف رسمی اظہار خیال کر دینے ہی کو کافی سمجھ لیں تو رفتہ رفتہ ان کے اندر سے بھی اس کی نفرت کا احساس مدھم ہوتا چلا جاتا ہے اور زیادہ دن نہیں گذرنے پاتے کہ وہ برائی برائی نہیں رہ جاتی اور خاص وعام کم وبیش سبھی اس کے رنگ میں رنگے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس وقت وہ معاشرے کی ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ اس پر استحسان یا کم از کم اباحت کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے۔ اور اس کے اپنے اصولی اخلاقیات تک میں ردوبدل ناگوار نہیں رہ جاتا۔ یہ ایک مسلمہ نفسیاتی

حقیقت ہے اور سوسائٹی میں برائیوں کا پھیلاؤ ہمیشہ اسی انداز پر ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاں اس بات کی ہدایت کی گئی تھی کہ:

وَاللّٰهِ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَ لَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ......

"بخدا تم معروف کا حکم ضروری ہی کرتے رہنا اور منکر سے ضرور روکتے رہنا............"

وہیں اس بات سے بھی خبردار کر دیا گیا تھا کہ :۔

اولیضربن الله بقلوب بعضکم علی بعض (ابوداؤد: بحوالہ ریاض الصالحین)

"ورنہ اللہ تعالیٰ تم سب کے دلوں کو ایک جیسا (منکر پسند) بنا دے گا۔

لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس ہدایت اور اس تنبیہ کو اپنے دماغوں میں محفوظ نہ رکھا۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ برائیوں میں غرق ہو جانے کے مذکورہ بالا نفسیاتی اصول نے انہیں پوری طرح اپنی زد میں لے لیا۔ جس وقت فکری گمراہیوں اور عملی خرابیوں نے ان کے اندر گھسنے کی کوشش کی انہوں نے ان کی مسلسل مزاحمت نہیں کی۔ اور آہستہ آہستہ ان سے مانوس ہوتے گئے۔ پھر جب اسی حالت پر صدیاں گذر گئیں تو اب وہ صورت پیدا ہو چکی ہے جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یعنی عام مسلمانوں کے دل، ان کے دماغ، ان کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے انداز فکر سبھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو چکے ہیں۔ جس چیز سے نفرت ہونی چاہیے تھی اس سے رغبت کی جا رہی ہے، جس چیز سے بھاگنا چاہیے تھا اس کی طلب میں دوڑ لگائی جا رہی ہے، جس چیز کو پیروں تلے روند ڈالنا چاہیے تھا وہ دانتوں سے پکڑی جا رہی ہے۔ ان کے پیغمبر نے انہیں ایمان کی آخری حد یہ بتلائی تھی کہ برائی کوئی بھی ہو اس سے دل میں نفرت رکھی جائے، ایسی نفرت جو اس برائی کو مٹا ڈالنے کے لیے برابر ابھارتی رہے، اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ نبی ﷺ نے کسی برائی کا پسند کرنا ہی ایمان کے منافی نہیں قرار دیا تھا، بل کہ اسے دیکھ کر اپنے اندر جذبۂ نفرت نہ پانے کو بھی ایمانی موت کی یقینی علامت ٹھہرایا تھا۔ مگر اب آپؐ کے پیروؤں کو اس امر پر اصرار سا ہے کہ ہم کسی کراہت اور احساس نفرت کے بغیر انسانی حاکمیتوں کو سلامیاں دیں گے، ان کی طاعتوں کا جوا اپنی گردنوں پر رکھیں گے۔ ان لوگوں سے اپنے معاملات کا فیصلہ کرائیں گے جنہوں نے اپنی "عدالت گاہوں" میں خدا کا "داخلہ" بند کر رکھا ہے ، بل کہ خود بھی انہی کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلے کریں گے۔ اور اگر موقع ملا تو خود اپنی بھی حاکمیت کا پھریرا لہرا دیں گے۔ اپنی آزاد مرضی سے قانون سازیاں کریں گے۔ جس چیز کو چاہیں گے جائز اور جس

چیز کو چاہیں گے ناجائز ٹھہرائیں گے۔ اور پھر بھی نہ ہمارا دین جائیگا، نہ ہمارا ایمان خراب ہو گا، نہ ہماری توحید متاثر ہو گی، نہ ہماری عبودیت پر حرف آئے گا، نہ ہمارا اتباع رسول کا دعوی غلط ٹھہرے گا۔ نہ ہم پر کتاب الٰہی کے چھوڑ بیٹھنے کا الزام عائد ہو گا اور نہ ہم اپنے اللہ سے عہد شکنی کے مجرم ہوں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم حالت اضطرار میں ہیں۔!!

اسے فریب نظر کہیے یا فریب نفس، بہر حال اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ ایک انتہائی مہلک اور خطرناک فریب ہے۔ اس کی خطرناکیوں اور ہلاکتوں کا پورا پورا اندازہ آپ کو اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ اس کے ان دور رس نتائج کا قدرے تفصیلی جائزہ لے لیں جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر مرتب ہوتے ہیں۔

غیر اللہ کی حاکمیت میں ایک وفادار رعایا بن کر رہنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ ہم نے اسلام کی ایک بنیادی تعلیم کی خلاف ورزی کی، بل کہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اب ہماری پوری زندگی شعوری یا غیر شعوری طور، پر ایسے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی جو اسلام کے مطلوبہ سانچے سے بالکل مختلف ہو گا۔ اب ہمارے معاشرے کی تاسیس ہمارے تمدن کی اٹھان، ہمارے نظام تعلیم کی ترتیب، اور ہمارے معاشی اور اقتصادی مسائل کی تنظیم ایسی بنیادوں پر ہو گی جو ہماری خواہشوں کے علی الرغم ہم کو اپنے اجتماعی مسلک اور اپنے تصورات زندگی سے دور پھینکتی چلی جائیں گی۔

غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے اور کرانے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ایک گناہ سرزد ہو رہا ہے۔ بل کہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان بہت سے احکام اسلامی کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ اور ان کی وقعت دلوں سے محو ہو جانے دی گئی جو ہماری زندگی کے ایک دو نہیں بل کہ بے شمار معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے دین اور قرآن کو سمیٹ کر مسجدوں اور حجروں میں بند کر دیا اور اس کے صرف اتنے حصے پر اکتفا کر لیا جس کا تعلق بس چند مخصوص مذہبی رسوم اور عبادات سے ہے۔

یہ محض عالم قیاس کی باتیں نہیں ہیں بل کہ واقعات اور حقائق ہیں جنہیں ہر وہ شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، جس نے اپنے دینی احساس کو کند نہ بنالیا ہو۔ ملت کے علم برداروں نے قرآن کے ایک بڑے حصے کو اقتدار کے حاصل نہ ہونے کا عذر کر کے اور اولوالامر کو اس کا بنیادی مخاطب قرار دے کر، اور پھر اضطرار کی آڑ لے کر زمانہ سازی کی جو روش اختیار کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قرآن کے کتنے ہی احکام اور اصول سے ان کا عملی رشتہ کٹ کر رہ گیا ہے اور دین کے

صرف ایک محدود حصے ہی پر وہ عمل کرسکنے کے قابل رہ گئے ہیں۔ ابتدا میں دین کے ان بنیادی اصولوں اور اس کے ان اہم تقاضوں سے اس جبری علیحدگی پر ایمانی خودی مضطرب تو ضرور ہوئی مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا یہ اضطراب سکون واطمینان سے بدلتا گیا۔ اور اب نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ دین صرف انہی چند عبادات اور مذہبی رسوم تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، جن کو لوگ عموماً ادا کرلیا کرتے ہیں اور ان کے علاوہ جو کچھ ہے دین سے اس کا تعلق، غیر محسوس طور پر بس برائے بیت ہی خیال کرلیا گیا ہے۔ اگر فکر و نظر کے زاویے ایسے نہ بن گئے ہوتے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ان اجزائے دین پر اگر عمل نہیں ہورہا تھا تو اسی کے ساتھ ان کی نظری اہمیت بھی گھٹ جاتی ؟ اور اس حد تک گھٹ جاتی کہ دل ان کے لیے کسی اضطراب، کسی تمنا، اور کسی حسرت سے بھی محروم ہو جاتے ؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ مسجد کی ایک اینٹ بھی اگر کھود کر پھینک دی جائے تو اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانوں کی گردنیں خون کے دریا بہانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ مگر اللہ کے بے شمار احکام کی مظلومیت پر بہانے کے لیے انکے پاس چند قطرے آنسو بھی نہیں ہوتے۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ تو دین کا کام سمجھا جاتا ہے اور یہ کچھ دنیا کا۔ لیکن چونکہ یہ احکام بھی اسی قرآن میں موجود ہیں جس میں ان چند مخصوص عبادات اور رسوم کا ذکر ہے اور ہر اس حکم کے اتباع کا قول دیا گیا ہے جو قرآن (وسنت) میں ہو، اس لیے زبان سے یہ کہنے کی جرأت تو نہیں ہوتی کہ یہ احکام دین سے غیر متعلق ہیں۔ مگر جب ان پر عمل کرنے کا اور ان کے سلسلے میں دیئے ہوئے قول کو پورا کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر دین کا وہی محدود تصور اور سہل پسندی کا مخفی جذبہ کبھی ان احکام کا اصل مخاطب بننے ہی سے انکار کرادیتا ہے۔ اور کبھی رخصت اضطرار کی ڈھال ہاتھ میں تھمادیتا ہے۔

غرض حقیقت حال اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ غیرت ایمانی کی کمی، احساس فرض کی پژمردگی اور سہل پسندی کے غلبے نے کافرانہ اقتدار اور باطل اصول و نظریات کے سامنے سپر ڈالنے پر آمادہ کیا۔ پھر اس آمادگی نے قرآن کے ایک بڑے حصے کو عمل واتباع کی حدود سے خارج کردینے پر مجبور کردیا۔ بعد ازاں اس مجبوری نے خدا پرستی کا بھرم رکھنے اور اپنی نگاہوں سے آپ اپنی خطاکار صورت چھپائے رکھنے کے لیے دین کے تصور ہی کو محدود اور بے روح بنا کر رکھ دیا۔ ایسا محدود

کہ جن احکام پر عمل نہیں ہو رہا ہے نظری طور پر بھی وہ ہماری آزادروی پر کبھی انگلی تک نہ اٹھا سکے۔ پھر اس محدود اور بے روح تصور دین نے ملت کی اس عظیم معصیت اور بے عملی کے اس احساس کو بھی سلا دیا۔ سب سے آخر میں سیاسی اقتدار سے محرومی اور اضطرار کے حیلے آئے اور انہوں نے آکر ان تمام رخنوں کو ڈھک لیا جو ہزار کوششوں کے باوجود ان نظریات کے اندر دکھائی پڑ ہی جاتے تھے۔ اور اب یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے غذا حاصل کر رہی ہیں اور سب نے مل کر مغالطوں اور خوش فہمیوں کا ایسا جال تیار کر دیا ہے جس کے اندر غور و فکر کی قوتیں صید زبوں بن کر رہ گئی ہیں۔ نتیجہ اس پوری صورت حال کا یہ ہے کہ مسلمان پر حقیقت بینی کی راہ بند سی ہو گئی ہے اور اس میں تلاش منزل کی امنگیں بھی دم توڑتی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے جس میں کوئی مسلمان مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص میں اپنی غلطی کا احساس زندہ ہو تب تو یہ امید ضرور کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس کی اصلاح کر لے گا۔ لیکن اگر یہ احساس ہی مردہ ہو گیا اور اس کی نظر میں غلطی غلطی ہی نہ رہ گئی تو پھر اس کے اصلاح پذیر ہونے کی کوئی توقع باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لیے اگر اس ملت نے اپنی کامل تباہی اور دین و دنیا دونوں کی رسوائی کا تہیہ نہ کر لیا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنی بے گناہی کے زعم باطل سے جلد از جلد باز آجائے اور اتباع دین کے معاملے میں جو کوتاہیاں اس سے سرزد ہوتی چلی آ رہی ہیں ان کو سیدھی طرح تسلیم کر کے اس کی تلافی کی کوشش کرے۔

نگاہ مسلم کی بے بصیرتی:

اللہ تعالیٰ کی ہدایت بخشی کا معاملہ بھی عجیب شان رکھتا ہے۔ ایک ہی چیز ہوتی ہے جس سے کسی کے سامنے ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ حقیقت کو پا لیتا ہے۔ مگر وہی چیز دوسروں کے لیے ضلالت کا پیام بن جاتی ہے اور وہ اس کے باعث راہ راست سے اور دور ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اس قانون عدل پر ہے کہ جو حق کی سچی طلب رکھتا ہے اسی کے سامنے اس کی راہ کھولی جاتی ہے اور جو حق سے بے اعتنائی برتتا ہے اس کے سامنے اس کی تجلی کبھی نہیں چمکتی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ سورج کی کرنیں بینائی والوں کے لیے پوری دنیا کو روشن کر دیتی ہیں، مگر الوؤں اور چمگادڑوں کی نگاہیں اپنے جبلی نقص کی بنا پر ان کے فیضان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتیں۔ چنانچہ قرآن نے اپنی صفت جہاں یہ بتائی ہے کہ میں لوگوں کے لیے مشعل ہدایت

ہوں وہیں یہ بھی کہا ہے کہ میں بہتوں کے لیے گمراہی کاذریعہ بھی ہوں (یُضِلُّ بِهٖ كَثِيراً وَّيَهدِي بِهٖ كَثِيراً) اس کے اس قول میں اسی قانون ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہ راست اسی شخص کو دکھاتا ہے جو دیکھنا چاہے اور اسی وقت دکھاتا ہے جب دیکھنے کی اسے حقیقی آرزو ہو۔ لیکن جو اپنی آنکھیں بند ہی رکھتا ہے اسے زبردستی ڈھکیل کر اس راہ پر ڈال نہیں دیا جاتا بل کہ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ اس بے اعتنائی کے ردعمل میں وہ اس سے کچھ اور دور جا پڑتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ قانون صرف کفار ہی کے لیے ہے اور مومن چوں کہ اس پر ایمان لا چکے ہیں اس لیے اب وہ اس قانون کے دائرہ نفاذ سے باہر ہیں، نہیں بل کہ یہ کافر اور مومن سب کے لیے عام ہے۔ ایک مومن بھی، قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود زندگی کے مختلف معاملات میں اس سے کسب ہدایت اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ پورے اخلاص کے ساتھ اس کی خواہش اور کوشش بھی کرے۔ ورنہ جس وقت بھی اور زندگی کے جن معاملات میں بھی، اس نے اس سے رہنمائی کی خواہش نہ کی، اور غیر مشروط طور پر اس کی پیروی کرنے کی، اور اس غرض سے اس کا زاویہ نگاہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی اس وقت وہ اس کو گمراہیوں کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے گا، اور اس بات کا لحاظ نہ کرے گا کہ وہ میرا منکر نہیں بل کہ میرا ماننے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت پالینے کے بعد بھی اپنے قلب و نظر کو کجروی سے مامون نہ سمجھے، اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ خدایا میرے سامنے سے ہدایت کی روشنی گل نہ ہونے پائے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔

قرآن کے ان احکام کے بارے میں جو اس وقت زیر بحث ہیں دراصل یہی قانون ہدایت کام کر رہا ہے۔ چوں کہ ان کے سلسلے میں امر حق معلوم کرنے کی سچی خواہش باقی نہیں رہی اس لیے نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا تھا کہ جہاں سے سمت منزل کی رہنمائی ہو رہی تھی ٹھیک اسی جگہ سے بھٹکنے کا سامان فراہم کر لیا گیا۔ قرآن و سنت میں جو اس اندازِ خطاب کے ساتھ احکام آتے ہیں کہ اے مومنو! ایک خدا کی فرماں روائی کے آگے خود جھکو اور سارے عالم کو اسی راہ راست کی طرف بلاتے رہو، اے ایمان لانے والو! کفر کے علمبرداروں سے لڑ کر فتنہ و فساد کا سر کچل دو، اے ایمان رکھنے والو! معروف کا حکم دو اور منکر سے روک دو، اے مسلمانو! چور کا ہاتھ کاٹ دو، اے اہل ایمان! زانی کو درّے لگاؤ۔ وغیرہ ذالک۔ تو اس انداز خطاب کی اصل بنیاد ایک عظیم الشان حقیقت پر تھی کہ جس کا صحیح تصور ہی اس کارگہ حیات میں مومن کا مقام متعین کر دینے

کے لیے کافی تھا۔ اگر ہم امر حق کی سچی طلب لے کر قرآن پر نگاہ ڈالتے تو پاتے کہ یہ طرز خطاب اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اللہ تعالی کی نگاہ میں اس امت کی حیثیت ایک صاحب اقتدار پارٹی سے کم کی ہے ہی نہیں۔ وہ اس کا مقام رہبانیت کے حجروں میں یا محکومی کے جوئے تلے نہیں بل کہ امامت و جہانبانی کے تخت پر بتا رہا ہے اور اس مقام سے نیچے وہ اس کی حیثیت کو فرض ہی نہیں کرتا۔ نہ اس سے نیچی سطح پر وہ کبھی اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ سوچیے تو سہی ملّی زندگی کا کتنا بلند تصور تھا جو اس اسلوبِ بیان کے پیچھے موجود ہے، اور قلب مسلم کو کیسے پاکیزہ اور عالی عزائم سے معمور کر دینے والا پیام تھا جو یہ اشارۂ قرآنی دے رہا ہے؟ مگر قصور نظر کا برا ہو۔ اس چشمۂ حیوان کو بھی ہم نے اپنے لیے بحر ہلاکت بنالیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ رب العزت کے اس طرز خطاب کی حکمت کو سمجھ کر اپنا کھویا ہوا مقام اور بھولا ہوا فریضہ یاد کر لیا جاتا۔ اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو کر ان کی تلافی کی کوشش کی جاتی اور پھر اس مقام کی بازیافت کی سرفروشانہ جدوجہد میں لگ جایا جاتا۔ جہاں ہمارا آقا ہم کو دیکھنا چاہتا ہے اور جہاں پہونچے بغیر ہم اس کے بہت سے احکام کی تعمیل اور اس کی پوری رضامندی کی تحصیل کر ہی نہیں سکتے۔ مگر افسوس کہ یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ بل کہ یہ کہہ کر کہ ان احکام کے مخاطب تو حکام اور اولوالامر ہیں، ہم نے اپنی ذمہ داری کا بوجھ ہی اتار کر پھینک دیا۔

بالکل اسی انداز سے آیت اضطرار پر بھی نظر ڈالی گئی "غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" کی شرطوں میں غیرت حق کے تحفظ کا جو راز چھپا ہوا تھا اور ناموافق سے ناموافق مواقع میں بھی اپنے ایمانی ذوق کی بلندی بر قرار رکھنے کا ان میں جو مطالبہ موجود تھا اس کی طرف نظریں گئیں ہی نہیں یا گئی ہوئی نظریں پھیر لی گئیں اور "فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ" پر انہیں لا کر اس طرح جما دیا گیا کہ پھر دین کی پیروی میں نہ کسی قربانی کا سوال باقی رہ گیا نہ وہ نفس پر کچھ ایسی گراں رہ گئی۔ بلا شبہ اس آیت میں بحالت مجبوری حرام سے استفادے کی رخصت عطا کی گئی ہے۔ لیکن یہ آیت کا صرف ایک پہلو ہے اور اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ بھی نگاہ میں رہے۔ آیت کے اس دوسرے پہلو کی ترجمانی "غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" کے الفاظ کرتے ہیں۔ ان لفظوں میں حرام سے استفادہ پر جو شرطیں لگائی گئی ہیں ان کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ مسلمان اگر کسی حرام سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو جائے تو چاہیے کہ اسے استعمال کرتے وقت اپنے اندر اس کی کوئی رغبت محسوس نہ کرے اور نہ بالکل ناگزیر مقدار سے زیادہ اسے استعمال کرے، بل کہ انکا مطلب یہ بھی ہے کہ اس حالت سے نکلنے اور اس استعمال حرام سے نجات پا جانے کی اسے گہری فکر اور بے تابانہ کوشش کرنی چاہیے،

بالکل اسی طرح جس طرح کہ کسی شخص کا پاؤں اگر نکیلے اور تپتے ہوئے سنگریزوں پر پڑ جاتا ہے تو وہ تلملا کر اسے جلد از جلد اٹھالینا چاہتا ہے، اور جب تک اس حالت سے نجات نہ مل سکے بس یوں سمجھتا رہے کہ مردار کا سڑا گوشت ہے جس کو دانتوں سے نوچ رہا ہوں یا خنزیر کی بوٹیاں ہیں جن کو نگل رہا ہوں، یا سڑاند بھری غلاظت ہے جس سے جسم اور کپڑے لت پت ہو گئے ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آیت کا یہ پہلو بھی اگر ہماری نگاہوں میں ہوتا اور اس کے بتائے ہوئے اس ایمانی ذوق کے اگر ہم قدر شناس ہوتے تو اس وقت ہماری دنیا یہ دنیا نہ ہوتی، اور وہ شکست خوردہ ذہنیت وہ پست نقطۂ نگاہ اور وہ ایمان سوز طرزِ فکر ہماری قوتوں کو اس طرح مفلوج نہ کر دیتا، اور کروڑوں انسانوں کی اتنی بھاری جمعیت اضطرار کے نام پر صدیوں تک باطل کے ساتھ اس طرح کی قابل شرم سازگاری نہ دکھاتی کہ اتباع قرآن کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اس کا قافلہ زندگی کی غیر اسلامی راہوں پر پورے ذوق وشوق کے ساتھ چلا جا رہا ہے اور نہ تو اس کا ضمیر کبھی اسے جھٹکا دیتا ہے۔ نہ اس کی ایمانی غیرت کبھی اس کا دامن پکڑتی ہے۔ اس کے بخلاف ہوتا یہ کہ باطل افکار، غلط نظریات اور غیر اسلامی نظام ہائے حیات کے خلاف ہم مجسم احتجاج ہوتے۔ ہمارا ایمانی مزاج ہماری زندگی کو تلخ بنا دیتا، اور ہماری اسلامی حس ہمیں مجبور کر دیتی کہ اس گندگی کو جس طرح بھی ہو سکے اپنے دامن سے دھو کر دم لیں لیکن افسوس ہے کہ ہم کو اضطرار کی رخصت تو یاد رہ گئی مگر "غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" کی شرطیں اور ان شرطوں کے تقاضے سب فراموش ہو گئے۔

امید ہے ان بحثوں کے بعد یہ اب کوئی مشکوک حقیقت نہ رہ گئی ہوگی کہ دین کے موجودہ جزوی اتباع پر مطمئن رہنا اور اسے اپنے ایمانی فرائض سے عہدہ برآ ہو سکنے کے لیے کافی سمجھ بیٹھنا کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ ایک ایسی غلط فہمی، بل کہ نافہمی ہے جسے افسوسناک بھی کہنا چاہیے اور خطرناک بھی، ایسا سمجھنا در اصل ایمان کے بے جان ہو جانے کی دلیل ہے یا پھر دین کی بصیرت سے محروم ہو جانے کا ثبوت۔ یہ فریب نفس کا ایسا خطرناک طلسم ہے جو اگر پوری قوت سے نہ توڑا گیا تو قلبِ ملت کی وہ کمزور دھڑکنیں بھی ختم ہو جائیں گی جو ابھی تک کبھی کبھی محسوس ہو جایا کرتی ہیں۔

(۲) ناسازگار حالات کا عذر

اب اس گروہ کے خیالات کو لیجئے جو اس نصب العین اور اس واحد فریضۂ حیات کی بجا آوری سے اس لیے کترا رہا ہے اور دوسروں کو بھی کترا کر چلنے کا مشورہ دے رہا ہے کہ موجودہ حالات اس کام کے لیے کسی طرح سازگار نہیں۔ اور ان کے اندر اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔

پھر حالات کے اس مطالعہ کا تقاضا وہ یہ بتاتا ہے کہ فی الحال اس کام کا نام بھی نہ لیا جائے اور اس کے بجائے اپنی ساری قوتیں کسی ایسے مورچہ پر سمیٹ دی جائیں جہاں سے ہم حالات کی رفتار پر اس طرح اثر انداز ہو سکیں کہ مستقبل کی فضا اس کام کے لیے اتنی تاریک نہ رہ جائے، یہاں تک کہ ایک وقت چل کر ہم اپنی اس حقیقی منزل مقصود کی طرف علانیہ مارچ کر سکیں۔

چند تنقیحی سوالات:

اس نظریئے پر غور کیجئے تو قدرتاً ذہن میں یہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) کیا اس فریضے کی ادائیگی کے لیے براہ راست جدوجہد کرنے میں حالات کی ناسازگاری اور اس جدوجہد کی کامیابی کے امکان وعدم امکان کی بحث پیدا بھی ہو سکتی ہے؟

(۲) کیا آج کے حالات میں دین کی اقامت واقعی ناممکن ہے؟

(۳) ناسازگاریٔ حالات کی بنا پر اس منزل کی طرف پھیر کے راستوں سے پیش قدمی کرنے کی کوئی عملی مثال، کوئی انسانی تجربہ، یا کوئی صحیح فکری بنیاد موجود ہے۔

ان سوالوں کا صحیح جواب جب تک معلوم نہ ہو جائے اس نظریے کا حق یا ناحق ہونا بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کے طریقِ کار اور اسوۂ اعمال سے ان کے واضح جوابات حاصل کئے جائیں۔

اللہ کی کتاب سے اس لیے کہ اسی نے اپنے پیروؤں پر یہ بار عظیم ڈالا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کا یہ دعویٰ ہے، جس کی صداقت کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا کہ وہ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ دوسرے تمام امور میں تو اس نے ہماری رہنمائی کی ہو اور اسی مسئلے کو تاریکی میں چھوڑ دیا ہو جو سارے مسائل سے زیادہ اہم تھا اور جو تمام فرائض دینی کا صدر نشیں ہے۔

اللہ کے رسولوں کے طریقِ کار اور اسوۂ اعمال سے اس لیے کہ ان پاکانِ خاص اور ان کے سچے پیروؤں کے سوا دنیا کسی ایسے انسان یا انسانی گروہ سے واقف ہی نہیں جس نے اس نصب العین کو اپنایا ہو۔

امکان کی بحث سے ادائے فرض کی بے نیازی:

پہلے سوال کا جواب اللہ کی کتاب یہ دیتی ہے کہ مومن کے لیے اپنے اصل فریضے اور مقصد وجود کی خاطر جد وجہد ہر حال میں ضروری ہے، اور اسے چاہیے کہ انجام کی پروا کئے بغیر اس میں ہر وقت لگا رہے۔ اسی طرح انبیائے کرام کا اسوہ بھی ٹھیک اسی بات کی گواہی دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے کہ جو نبیؑ بھی دنیا میں آیا اسے لوگوں کے سامنے آتے ہی یہ مطالبہ رکھ دینے کا حکم تھا کہ:۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل:۳۶)

"لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی پیروی سے بچو۔"

..... اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء:۲۵)

"..........بلاشبہ میرے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا میری بندگی کرو۔"

یہ چند حرفی مطالبہ دراصل اسی انقلابی مشن کا ایک اجمالی تعارف ہے جس کو اقامتِ دین کہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس وقت "عبادت" "الٰہ" "اور طاغوت" کے جن محدود مفہوموں سے عام ذہن آشنا ہیں ان کی بنا پر اس بات میں کچھ غلو محسوس ہو، لیکن قرآن مجید نے شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا............ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ فرما کر اس خیال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی ہے۔ کیونکہ اس کے ان لفظوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو رہی ہے کہ نوحؑ ہوں یا ابراہیمؑ، موسیٰؑ ہوں یا عیسیٰؑ، محمد ﷺ ہو یا کوئی اور پیغمبر، بلا استثنا ہر نبی کو اللہ کے نازل کئے ہوئے دین کی دعوت واقامت ہی کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ اس لیے "فَاعْبُدُوا اللّٰهَ" کا پورا اور صحیح مفہوم اس مفہوم کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا جو "اَقِيْمُوا الدِّيْنَ" کا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ان حضرات نے اپنے اس فریضے کو کس طرح ادا کیا؟ تو اس کے جواب میں کیا یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جس مشن اور مقصد کو لے کر یہ اصحاب عزیمت تشریف لاتے رہے ہیں اس کے اظہار واعلان میں یا اس کی جد وجہد میں انہوں نے ایک لمحہ کی بھی دیر لگائی ہو گی؟ یا یہ کہ حالات کی سازگاریوں کا جائزہ لیا ہو گا؟ یا یہ کہ امکان وعدم امکان کی بحثوں میں الجھے ہوں گے؟ اور جب اس جائزے اور بحث سے کامیابی کے روشن امکانات سامنے آگئے ہوں گے تب جا کر انہوں نے اپنی کشتیوں میں بادبان لگائے ہوں گے؟ ہو سکتا ہے کہ عقل مصلحت اندیش کا فتویٰ اس بارے میں کچھ اور ہو، مگر قرآن کا کہنا تو یہی ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ اس کے بخلاف ہر نبی نے اپنے اس فرض منصبی کی ادائی اس شان سے کی کہ نہ تو کبھی اس مہم کے

کامیاب ہو جانے کی اس نے خدا سے گارنٹی طلب کی، نہ ایک لمحہ اس کا انجام سوچنے میں ضائع کیا، نہ اس کے امکان اور عدم امکان کا اس کے ذہن نے سوال اٹھایا، نہ حالات کی کوئی ناسازگاری ایک دن کے لیے بھی اس سے اس آواز کو سینے میں دبا رکھنے کا مطالبہ کر سکی۔ بل کہ وہ اپنی بعثت کی ابتداء سے زندگی کے آخری لمحے تک اپنے اس فرض کو مسلسل بجالاتا رہا۔ ان میں اگر کچھ ایسے تھے کہ ان کی دعوت الی الحق کامیاب ہو گئی اور وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے سچے خدا پرستوں کا ایک گروہ پیدا کر کے دین اللہ کو غالب اور نافذ فرما گئے تو بیشمار ایسے بھی تھے جن کی آواز آخر تک بے حس دلوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوتی رہی۔ نوحؑ نے تقریباً ایک ہزار سال کے "لیل و نہار" اس ادائے فرض میں صرف کر ڈالے۔ مگر اس طویل اور صبر آزما جدوجہد کا انجام زیادہ تر صرف ان گالیوں اور پتھروں کی شکل میں نمودار ہوتا رہا جن سے ان کی "قوم" رات دن انہیں نوازتی رہتی تھی اور جب وہ اپنا فرض بجالا کر دنیا سے رخصت ہونے لگے تو ان کی دعوت قبول کرنے والوں کی تعداد گنتی کے چند افراد سے زیادہ نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام بڑھاپے کی عمر تک بندگیٔ رب کا پیغام سناتے پھرے اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کی لگاتار کوششیں کرتے رہے۔ اس کوشش اور پیغام رسانی میں انہیں جیسی جیسی ابتلاؤں اور مصیبتوں سے گذرنا پڑا وہ شاید ہی اپنی نظیر رکھتی ہوں گی، لیکن اس ساری تگ ودو اور ان پیہم قربانیوں کا ظاہر میں جو ثمرہ نکلا وہ یہ تھا کہ ان کے اپنے اہل و عیال اور بعض قریبی اعزہ کے سوا مشکل ہی سے کوئی ان کی آواز پر لبیک کہنے والا تھا۔ حضرت لوط، شعیبؑ، ہودؑ، صالحؑ اور عیسیٰ علیہم السلام وغیرہ انبیائے کرام کی سرگزشت بھی کم و بیش اسی قسم کی ہے۔ پھر اسی مقدس گروہ میں حضرت یحیٰ علیہ السلام جیسے حضرات بھی موجود ہیں۔ جن کی تبلیغ و ہدایت کا انجام یہ ہوا تھا کہ حق کا فدائی تو انہیں ایک نہ ملا۔ لیکن ان میں سے کسی کی گردن اڑادی گئی اور کسی کے سر پر آرے چلا دیئے گئے۔ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ (آل عمران)

اور قریب آکر دیکھیئے، خاتم النبیین ﷺ کا طرز عمل اس واقعیت کا سب سے واضح اور مفصل ثبوت ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آپ کی پیغمبرانہ ذمہ داریاں ہر نبیؑ سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ آپ کو جو دین قائم کرنے کے لیے دیا گیا تھا وہ جامع ترین دین تھا۔ دوسری طرف اس دین کا مخاطب کسی ایک مخصوص قوم اور ملک کے بجائے پورا عالم انسانی تھا۔ اور اس عالم انسانی کا حال یہ تھا کہ اس کے ایک ایک گوشے میں طاغوت کا علم گڑا ہوا اور کفر و شرک کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آپ جب منصب نبوت پر سرفراز ہوتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ:۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (الحجر:۹۴)

"جس تعلیم کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اسے واشگاف پہونچا دو اور مشرکوں سے کنارہ کش رہو۔"

آپ اس حکم کی تعمیل میں جیسا کہ چاہیے تھا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی دعوت لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور اسے فطری رفتار سے وسعت دیے جاتے ہیں۔ چند سال بھی نہیں گذرنے پاتے کہ یہ پکار گھروں، گلیوں، مجلسوں اور قریبی حلقوں سے آگے بڑھ کر پہاڑ کی چوٹیوں سے بلند ہونے لگتی ہے۔ سننے والوں نے جس طرح اس پکار کا جواب دیا اس کو مکہ اور طائف کی گلیاں قیامت تک نہ بھولیں گی۔ لیکن خدا کے اس فرض شناس بندے کو ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ اسکو اگر پرواہوتی ہے تو صرف اس بات کی کہ جس کلمۂ حق کے پہونچانے کا فریضہ مجھ پر عائد کیا گیا ہے اس کو پہونچا دینے میں کوئی کسر نہ رہ جائے، یا پھر اس بات کی کہ بھٹکتی ہوئی انسانیت کی نجات اور بہبود جس صداقت پر منحصر ہے اس کو یہ سنتی اور مانتی کیوں نہیں؟ اس کی ساری تمنائیں بس اسی ایک تمنا میں سمٹ کر رہ گئی ہیں کہ کسی طرح میری بات دلوں میں اتر جائے اور جس دین کو اللہ نے میرے ذریعے نازل فرمایا ہے اس کے بندے اپنے کو اس کے حوالے کر دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ہے کہ اس کو بار بار اور محبت کے ساتھ جھڑکتا ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ تمہارا کام امر حق کو صرف پہونچا دینا اور کھول کھول کر بیان کر دینا ہے اس کے بعد اگر ایک شخص بھی اسے سن کر نہیں دیتا تو اس کی پروا نہ کرو۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ۔ اس لیے تم اپنی اس دعوت کا کام انجام سے بالکل بے پرواہو کر بجالاتے رہو۔ یہ نہ سوچو کیا ہوگا؟ ہو سکتا ہے کہ تم اپنی ہی آنکھوں سے اس دعوت کو کامیاب اور اس کے دشمنوں کو تباہ و برباد دیکھ لو۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ ایسا نہ ہو:۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْنَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ. (یونس:۴۶)

"اور اے پیغمبر! جس عذاب کی ہم ان منکروں کو دھمکی دے رہے ہیں یا تو اس کا کچھ حصہ ہم تمہیں دکھا دیں گے (اور تمہاری نگاہوں کے سامنے ہی یہ اپنے انجام بد سے کسی قدر دوچار ہولیں گے یا اس کے قبل ہی) ہم تم کو وفات دے دیں گے۔ کیوں کہ ہماری ہی طرف تو ان کو پلٹ کر آنا ہے پھر یہ کہ ان کے سارے اعمال خدا کی نگاہ میں ہیں۔"

یہ تاریخِ انبیاء کے چند مشہور و معروف ابواب ہیں، جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی ہدایت اور سبق اموزی کے لیے قرآن حکیم میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان سرگزشتوں میں اتباع حق کا جو اصول سب سے زیادہ نمایاں، اور جو نقش حقیقت سب سے زیادہ ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کے دین کی اقامت کیلیے کوئی شگون لینے کی ضرورت نہیں۔ نہ حالات کی سازگاریوں کا اندازہ لگانے کی کوئی گنجائش ہے اور نہ کامیابی کے امکانات ٹٹولنے کا کسی کو حق ہے۔ جو چیز ہمارا فریضۂ زندگی قرار پاچکی ہے وہ ہر حیثیت سے اس بات کی مستحق ہے کہ جب تک زندگی ہے اس کے لیے پوری پوری جدوجہد کرتے رہیے۔ وہ فرض دراصل دل سے فرض مانا ہی نہیں گیا جس کو مشکلات کے اندیشے سرد خانے میں ڈلوادیں، اور جو امکان وعدم امکان کی بحثوں کا زخم کھاسکے۔ اگر دعوت توحید اور اقامت دین کا کام شروع کرنے سے پہلے امکانات کا جائزہ لینا صحیح ہوتا تو یقین جانئے کہ انبیاء کی ایک بڑی تعداد اپنے مشن کا نام بھی زبان پر نہ لاتی۔ اس کے لیے عملی جدوجہد کا تو کیا سوال پیدا ہوتا؟ کیونکہ انبیاء علیہم السلام اقامت دین کا مشن لے کر دنیا میں عموماً بھیجے ہی اس وقت جاتے تھے جب اس کام کے لیے حالات کی ناسازگاریاں اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور جب کلمۂ حق کا نشوونما بظاہر ناممکن سے ناممکن تر ہو چکا ہوتا تھا۔ لیکن حالات کی ان شدید ناسازگاریوں اور امکان کامیابی کی بظاہر ان انتہائی کم یابیوں کے باوجود، جن سے ہم اپنے زمانے کی ناسازگاریوں اور دقتوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کرسکتے، انہوں نے بلا توقف کشتی سمندر میں ڈال دی۔ اور ذرا نہ سوچا کہ ساحل کہاں اور کدھر ہے؟ موسم پرسکون ہے یا طوفانی؟ ہوا موافق ہے یا مخالف؟ کشتی کھینے والے بازوؤں میں توانائی کتنی ہے؟ سمندر پیدا کنار ہے یا ناپیدا کنار؟ راستہ صاف ہے یا پانی کے اندر چٹانیں ہیں؟ اس طرح کا کوئی ایک بھی سوال نہ تھا، جس نے ان کے ذہنوں میں کبھی بار پایا ہو۔

پھر اب وہ کن لوگوں کا اسوہ ہے جو اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کا حق رکھتا ہے؟ اور جس کی سند پر ہم مشکلوں اور ناسازگاریوں کے پیش نظر اپنے مقصد وجود سے عارضی طور پر بھی "تائب" ہو جاسکتے ہیں؟ انبیاء علیہم السلام کا تو جو اُسوہ ہے، آپ نے دیکھا وہ اس طرح کی کوئی رعایت ہمیں دینے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ ہاں اگر ہم نے انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں کو عملاً خدانخواستہ مشرکین عرب کی طرح ''اساطیر الاولین'' کی حیثیت دے رکھی ہے اور انہیں ایسی گذری ہوئی داستانیں سمجھ بیٹھے ہیں جن کو ہمارے افکار و اعمال کا رخ متعین کرنے میں

کوئی دخل ہی حاصل نہیں، تب تو بات ہی دوسری ہے، لیکن اگر صورت واقعہ یہ نہیں ہے اور ہماری بد بختیوں نے ابھی تک ہمیں نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ کی حد تک نہیں گرایا ہے، بل کہ ہم ان سرگزشتوں کو اسی طرح ہدایت کا منارہ اور بصیرت کا سرچشمہ یقین کرتے ہیں جس طرح قرآن بتاتا ہے تو ان کے ورق ورق سے ہمیں یہی ہدایت ملے گی کہ جو چیز تمہارا فریضۂ حیات قرار پاچکی اس کی خاطر جدوجہد تم کسی حال میں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔

ناسازگاری احوال کا واقعی تقاضا:

کہا جائے گا کہ حالات بہر حال اپنا ایک وزن رکھتے ہیں۔ اور انسان کے فکر وعمل پر لازماً اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے عقل یہ کس طرح تسلیم کرلے کہ دعوت حق کے سلسلے میں وہ کسی اعتناء کے قابل ہیں ہی نہیں؟ بلا شبہ یہ ایک صحیح اور معقول بات ہے اور اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اوپر کی سطروں میں یہ بات کب اور کہاں کہی گئی ہے کہ حالات کا دعوت حق کی جدوجہد پر اثر بالکل پڑتا ہی نہیں؟ ان میں تو جو بات کہی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حالات کی ناسازگاریاں اس جدوجہد کو ملتوی یا منسوخ نہیں کراسکتیں۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر وہ اس جدوجہد پر کس حیثیت سے اثر انداز ہوتی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جتنی ہی زیادہ سخت وشدید ہوتی ہیں اس جدوجہد کو اتنا ہی زیادہ ضروری بنادیتی ہیں یہ جواب نقل اور عقل دونوں ہی کا ہے:۔

(۱) چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نبی عموماً ایسے ہی وقت میں اس کام پر مامور کیا جاتا رہا ہے جب کہ حق کی روشنی اس زمین سے بالکل ہی مفقود ہوچکی ہوتی تھی اور کفر و مادیت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں اس کی دعوت کا امکان کامیابی دور دور تک بھی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ جدوجہد ایسے ہی ماحول سے زیادہ مانوس ہے اور حق تعالیٰ کی مرضی اسی بات میں ہے کہ اس طرح کے تاریک حالات میں صداقت کا چراغ ضرور جلایا جائے اور اس کے بندے اس کے دین کے لیے جو کچھ بھی کرسکتے ہوں اس سے ہرگز دریغ نہ کریں۔ اور یہ غالباً اس لیے کہ اس کی رافت ورحمت کو اس گہری تاریکی کا اور بڑھ جانا گوارا نہیں رہ جاتا۔

(۲) ٹھیک یہی بات عقل بھی کہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جب اللہ کا دین نوع انسانی کے لیے ہدایت اور روشنی ہے تو جس جگہ کا انسان جتنا ہی زیادہ گمراہی اور تیرگی کا شکار ہوگا اس جگہ اس ہدایت اور روشنی کی ضرورت بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ دعوت حق کے لیے سخت وشدید ناسازگاریوں کے معنی یہ ہیں کہ حق سے بے اعتنائی اور دوری حد سے آگے بڑھ چکی ہے اور لوگ اندھیارے

سے محبت کرنے لگے ہیں۔ اس لیے ان ناسازگاریوں کا واقعی تقاضا صرف یہی ہو گا کہ جو لوگ انسانیت کو نورِ حق دکھانے پر مامور ہیں وہ خاموشی کو اپنے اوپر حرام کرلیں اور اونچی سے اونچی آواز میں انھیں اپنا پیغام سنائیں جو ہلاکت کی راہ پر اندھادھند بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ اگر دوسری طرح کے حالات میں ان کے لیے کچھ سہل انگاری کی گنجائش مان بھی لی جائے تو کم از کم اس طرح کی غیر معمولی حق بیزاری کی حالت میں ایسی کوئی گنجائش قطعاً نہیں مانی جاسکتی۔ حفظانِ صحت کا کوئی محکمہ اگر وبا پھوٹ پڑنے پر بھی خواب خرگوش سے نہ جاگے تو اس کی فرض شناسی کی داد کون دے سکتا ہے؟

عقل اور نقل دونوں کے اس متفقہ جواب کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس زمانہ میں لوگ حق سے جتنا ہی زیادہ بیگانہ ہوں، دہریت اور مادیت کی جتنی ہی زیادہ گرم بازاری ہو، طاغوت کی حکمرانی جتنی زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور پائیدار ہو، حق کے علمبرداروں پر دین اللہ کی اقامت کا فریضہ اتنا ہی زیادہ اہم اور ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر موجودہ حالات کے بارے میں یہ اندازہ صحیح ہے کہ اسوقت دنیا حق سے بری طرح متنفر اور برگشتہ ہو رہی ہے اور اسے اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں ہے تو یہ صورتحال اقامت دین کی جدوجہد میں کسی رعایت کا موجب بالکل نہیں ہے، بل کہ یہ مطالبہ اس بات کا کرتی ہے کہ اس مہم کو معمول سے زیادہ جوش، سرگرمی اور انہماک سے انجام دیا جائے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے تو معاملہ کی اہمیت اور بھی آگے بڑھی ہوئی معلوم ہو گی۔ یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں رہ جائے گی کہ اقامت دین کی جدوجہد امکان وعدم امکان کی بحث سے بالاتر ہے اور اس کو ہر وقت، ہر ماحول اور ہر حالت میں جاری رکھنا چاہیے، بل کہ اس حد کو پہونچ جائے گی کہ اگر حالات کے اندازے اس جدوجہد کی ناکامی کا یقین دلا رہے ہوں، حتیٰ کہ بالفرض اگر کوئی اپنی آنکھوں سے نوشتہ الٰہی میں اس ناکامی کو مقدر دیکھ لے تو بھی اس کے لیے اس میں لگے رہے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا کی عام تحریکوں اور اسکیموں جیسی کوئی تحریک اور اسکیم نہیں ہے کہ اگر اس کی کامیابی کے ذرائع مفقود اور امکانات ناپید نظر آئیں تو اس سے دست کش ہو جانے میں بھی کوئی حرج نہ ہو۔ نہ یہ مسلمانوں کے سر پر کوئی اوپر سے چپکی ہوئی ذمہ داری ہے کہ چاہا تو قبول کرلیا ورنہ ٹھکرا دیا۔ اور اگر قبول بھی کرلیا تو پھر جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے خارج کر دیا۔

اس کے برعکس ایک شخص کے مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس نے اس دین کی اقامت کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے اور حق سے محبت کرنے کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا کو محبوب ہوں اور جو باتیں حق ہوں انسان ان کو خود بھی اپنائے اور انہی کو اپنے گردوپیش بھی زندہ اور کار فرما دیکھنے کا دل سے آرزو مند ہو اور انہیں کار فرما بنا دینے کے لیے ہمہ دم کوشاں رہے۔ اسی طرح ہر اس چیز کو مٹا دینے کے لیے بے قرار اور مصروف تگ و تاز نظر آئے جو خدا کو ناپسند اور خلاف حق ہوں۔ چنانچہ اوپر نبی ﷺ کے ارشادات سے یہ حقیقت بالکل واضح کی جا چکی ہے کہ جس طرح آگ اور پانی کا اتحاد ممکن نہیں اسی طرح ایمان اور منکرات میں مصالحت ممکن نہیں، لہٰذا منکرات کو مٹانے اور ان کی جگہ معروفات کو قائم کرنے کی جدوجہد جو اقامت دین کی جدوجہد ہی کا دوسرا نام ہے۔ اسلام سے علیحدہ اور اس پر زائد کوئی چیز نہیں ہے۔ بل کہ اس کی اصل روح اور اس کی حرکت قلب ہے۔ اگر یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی جاندار زندہ تو ہو مگر اس کے قلب میں حرکت نہ ہو تو اسی طرح یہ بھی تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص ہو تو مومن، مگر اقامت حق کی تڑپ سے اس کے دل و دماغ خالی ہوں اور عملی جدوجہد سے اس کے دست و بازو یکسر نا آشنا۔ اس تڑپ سے خالی اور اس جدوجہد سے نا آشنا ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بل کہ اس کا مطلب در اصل اپنے مقصد حیات ہی سے کنارہ کش ہو جانے کے ہیں۔ جس کے بعد ظاہر ہے کہ مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اہل کتاب کے متعلق، جنہوں نے کہ اپنے اس مقصد زندگی کو فراموش کر رکھا تھا، قرآن نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کر دو تم کسی اصل پر نہیں ہو اور تمہارا ملی وجود ایک وجود موہوم کے سوا کچھ نہیں۔ (لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ) اس لیے یہ کہنا کہ اس زمانے میں اقامت دین ناممکن ہے گویا یہ کہنا ہے کہ اس زمانے میں مسلمان ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور حالات زمانہ کی ناسازگاری کے پیش نظر اقامت دین کی جدوجہد کو ترک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام ہی سے دست بردار ہو جانے کو بھی غلط نہ سمجھا جائے۔

غیرت کا سبق:

یہ بات کہ جو چیز زندگی کا اصل فریضہ قرار پا چکی ہو وہ امکان اور عدم امکان کی بحث سے بالاتر ہو جاتی ہے، کچھ اسلام اور مسلمان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بل کہ ایک عام اور مسلم

حقیقت ہے چنانچہ اگر انبیاء اور ان کے سچے پیروؤں نے اس مطالبہ کو پورا کر دکھایا ہے تو کافروں اور دہریوں کے یہاں بھی اس مطالبے کو ایک واجب التسلیم مطالبے ہی کی حیثیت حاصل ہے، اور وہ بھی نصب العین کے معنی یہی سمجھتے ہیں کہ نصب العین وہ چیز ہے جو آنکھوں سے کبھی اوجھل نہ ہو۔ جو زندگی کے میدان میں آنے کے لیے حالات کی اجازت کی محتاج نہ ہو۔ جو ماحول کی سازگاریوں کی خواہش مند تو ہو مگر ناسازگاریوں سے خوف بھی نہ کھاتی ہو اور جس کی خاطر جدوجہد میں اگر زندگی ختم نہ کی جاسکے تو وہ بالکل رائیگاں ہے۔ چنانچہ ان کی تاریخ اس بات کی عملی شہادتوں سے بھری پڑی ہے۔

مارکس کے پیرووں ہی کو لے لیجیے۔ اس کے چند مخصوص نظریات تھے جن پر وہ ایمان لائے اور انہی نظریات کی اقامت کو انہوں نے انسانی مسائل کا صحیح حل سمجھا۔ اس لیے اسی کام کو انہوں نے اپنی زندگیوں کا نصب العین بنالیا۔ اور اس کے لیے پوری یکسوئی اور کامل انہماک سے سعی و جہد شروع کردی۔ یہ سعی و جہد سب سے زیادہ زور و قوت سے اس مملکت میں شروع کی گئی جس میں وقت کی سب سے مستبد حکومت قائم تھی۔ جہاں زار نکولس کی شخصی آمریت اور قہاریت کے خلاف سانس لینا بھی بظاہر ممکن نہ تھا۔ مگر اشتراکی اصولوں پر معاشرے اور حکومت کی تنظیم کو اپنا مقصد زندگی قرار دینے والوں نے ان دشواریوں، ناسازگاریوں اور مصیبتوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں جو اس جدوجہد کے پردے میں چھپی انہیں گھور رہی تھیں۔ جب زؔار کے کانوں تک ان کی سرگرمیوں کی اطلاع پہونچی تو وہ ظلم اور انتقام کے تمام اسلحوں سے مسلح ہو کر پوری خشمناکی کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا۔ کتنوں ہی کو تو اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا جو بچ رہے ان کو سائبیریا کی برفستانی جہنم میں جھونک دیا۔ ظلم اور ایذا دہی کی کوئی ممکن صورت ایسی نہ تھی جس سے اشتراکیت کے ان "مومنوں" کو سابقہ نہ پڑا ہو۔ سالہا سال تک دارو گیر کا یہی ہنگامہ بپا رہا۔ مگر کوئی بڑی سے بڑی مصیبت اور ناسازگاری بھی ان کے عزم کو نہ ہلا سکی۔ اور اشتراکیت کا عشق آلام و مصائب کے طوفانوں سے انہیں برابر لڑاتا اور منزل مقصود کی طرف ان کے قدم لگاتار بڑھواتا ہی رہا۔

انہی اشتراکیوں میں آگے چل کر، جب کہ وہ زؔار کا تخت سلطنت الٹ کر اپنا اشتراکی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوچکے تھے، باہم اختلاف ہوگیا۔ لینن کی وفات کے بعد سیاست کی باگ ڈور اسٹالن کے ہاتھوں میں آگئی۔ جس نے آہستہ آہستہ اشتراکی نظام کو بین الاقوامیت کی سطح سے ہٹا کر قومی اشتراکیت کی سطح پر لانا شروع کیا۔ اس کی اس پالیسی سے جو اصول اشتراکیت سے فی الواقع

بالکل ہٹی ہوئی پالیسی تھی، اور جو دراصل مارکسی نظریات کے ساتھ کھلی ہوئی غداری تھی، ٹراٹسکی نے اختلاف کیا۔ اور اشتراکیت کی اصلی روح اور خالص مارکسیت کے قائم کرنے اور رکھنے پر زور دیا۔ اسٹالن نے نہ صرف یہ کہ اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا بل کہ اس کو اس جرم کی پاداش میں حکومتی ادارے ہی سے نکال دیا۔ خفیہ پولیس نے اس پر اور اس کے ہم خیالوں پر کڑی نگرانی عائد کر دی اور اس کی زبان پر تالے چڑھا دیئے گئے۔ مگر وہ جن اصولوں پر ایمان رکھتا تھا اور جن کے نفاذ میں اس کو دنیا کی فلاح نظر آ رہی تھی ان کی تبلیغ سے وہ باز نہ رہا۔ آخر جلاوطن کر دیا گیا۔ امریکہ پہونچا اور وہاں سے اپنے مشن کو پھیلانے اور اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے دشمن وہاں بھی پہونچے، اور ایک روز سازشوں کے ذریعہ انہوں نے اس کے سامنے موت کا پیالہ پیش کر دیا، جسے مارکسیت کے اس "مومن قانت" نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ قبول کر لیا، اور اپنے مقصد و نصب العین پر قربان ہو گیا۔

یہ تو کچھ پرانی باتیں ہیں۔ ذرا قریب کی تاریخ دیکھئے۔ یہ جاپانی اور جرمن قومیں جو زخموں سے چور آپ کے سامنے پڑی ہیں۔ ان کے کارنامے سنیئے۔ ان کے رہنماؤں نے ان کے سامنے ایک نصب العین رکھا۔ وہ اس پر "ایمان" لائیں۔ اور پھر اس کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو گئیں۔ حریف قوموں نے آگا روکا۔ انہوں نے اس روک کو تلوار کی نوک سے دور کرنے کی ٹھان لی۔ لڑائی کا میدان گرم ہو گیا۔ اور یہ دونوں قومیں اپنے اپنے دائروں میں سیلاب کی طرح آگے بڑھنے لگیں۔ اور چند ہفتوں کے اندر اندر ہزاروں مربع میل علاقوں پر قابض ہو گئیں۔ مگر قسمت نے یکایک پلٹا کھایا تو پھر اسی تیزی سے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئیں اور تباہیوں کی ان پر بری طرح بارش ہونے لگی۔ مگر اپنے نصب العین کا یہ عشق تھا کہ ان کے نوجوان موت کو منھ کھولے ہوئے دیکھتے اور اس میں کود جاتے۔ ہوائی جہازوں سے چھلانگ لگاتے اور بم لے کر سیدھے دشمن کی جنگی جہازوں کی چمنیوں میں جا پڑتے۔ بموں سے لدا ہوا ہوائی جہاز لے کر ان کے جہازوں پر جا گرتے۔ اور اس طرح دنیا کے جنگی لغت میں "خودکش ہوائی جہاز" اور "کفن بردوش طیارے" کی اصطلاحوں کا اضافہ کر گئے۔ پھر آخر میں جب قدرت نے ان کو اپنی آرزوؤں میں قطعی حد تک ناکام بنا دیا تو وہ اس عقیدے کے ساتھ "ہراکیری" (خودکشی) کرنے لگے کہ مرنے کے بعد دیوتا بن کر اپنی قوم کی خدمت اور اپنے مقصد کی خاطر جنگ کریں گے۔ اور ان کی عورتیں اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش اس جذبے سے کرنے لگیں کہ یہ بڑے ہو کر دشمنوں سے اپنی قومی عظمت کی تباہی کا انتقام لیں گے۔

یہ ان لوگوں کے نظریے اور کارنامے ہیں جنکا کوئی مستقبل نہیں۔ جن کی قربانیوں کا کوئی ثمرہ مرنے کے بعد ان کی اپنی ذات کو ملنے والا نہیں اور جن کے سامنے اگر کچھ ہے تو صرف اسی دنیا کے رذیل مقاصد ہیں۔ کیا ان واقعات اور حقائق میں ہمارے لیے عبرت کا کوئی درس اور غیرت کا کوئی پیام نہیں؟ کیا رضائے الٰہی اور سعادت اخروی میں اتنی بھی گیرائی نہیں جتنی کہ ان چندروزہ مادی مقاصد میں ہے؟ کیا ایمان باللہ میں اتنی بھی حرارت نہیں ہو سکتی جتنی کی ایمان بالطاغوت میں دیکھی جارہی ہے؟ کیا حق کی شہادت میں اتنی بھی جرأت نہیں دکھائی جانی چاہیے جتنی کہ باطل کی شہادت میں ان کے ماننے والے دکھایا کرتے ہیں؟ اور کیا اپنے فریضہ حیات کو اتنی اہمیت بھی اہل اسلام دینے کو تیار نہیں جتنی کہ یہ اہل کفر دے رہے ہیں؟ انبیائے کرام کے واقعات کو نفس حیلہ گر پیغمبرانہ جوش تبلیغ اور روح کی غیبی تائید کا نتیجہ قرار دیکر ٹال سکتا ہے مگر اہل کفر وضلال کی ان سرفروشیوں کے پیچھے کس معجزے اور غیبی تائید کا سراغ بتایا جائے گا؟ کاش ہم...... امکان و عدم امکان کی بحثیں چھیڑتے وقت باطل پرستوں ہی کے اعمال واخلاق پر ایک نظر ڈال لیتے۔ اور انہی سے مقصد زندگی کا حق ادا کرنا سیکھ لیتے۔ افسوس یہ منظر بھی کتنا عبرتناک ہے۔ جن کی نظر اسی عالم آب وگل تک محدود ہے وہ تو ادائے فرض میں فکر انجام سے اتنے بلند ہوں، اور وہ جن کا دعوی ہے کہ ہماری نماز اور ہماری قربانی، ہماری زندگی اور ہماری موت سب کچھ صرف اللہ کے لیے ہے، ناکامی کے اندیشے ڈھونڈنے میں مصروف رہیں۔ جو نقش حقیقت ایک اندھا ملحد بھی ہاتھوں سے ٹٹول کر معلوم کر لیتا ہے وہ ایمان کی روشنی رکھنے والی آنکھوں کو ذرا سجھائی نہیں دیتا۔

جذباتیت کا بے بنیاد طعنہ:

اگر چہ اس تقریر کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ادائے فرض کے سلسلے میں امکان کی بحث پیدا ہی نہیں ہوتی، اور ایمان کی غیرت اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ایمان کی غیرت تو الگ رہی کوئی خوددار اور باحمیت کفر بھی اس کا روادار نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کے باوجود ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ بات اس وقت کے مصلحت پرست اور عافیت پسند دماغوں میں شاید ہی گھس پائے گی۔ اور ہرگز خلاف توقع نہ ہوگا، اگر دانش و تدبر کے کتنے ہی دعویدار اک خاص بزرگانہ شان سے بول اٹھیں کہ یہ سب جذباتی باتیں ہیں جن کا دنیائے عمل سے کوئی تعلق نہیں۔ "اہل دانش" کے اس ریمارک کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول کر لیا جاتا اگر قبول کرنے کی کچھ بھی گنجائش ہوتی، کیونکہ ذمہ داری کا ایسا بھاری بوجھ اٹھانے اور خطروں سے اس طرح رندھی ہوئی

راہ اختیار کرنے کا خواہ مخواہ کسی کو کوئی شوق نہیں ہو سکتا۔ مگر دشواری یہ ہے کہ اس رائے کے قبول کرنے سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی۔ بل کہ اس میں مزید گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ کیونکہ پھر وہی عقل جس کی دہائی دی جارہی ہے پکار کر پوچھتی ہے کہ ایسا دین قبول ہی کیوں کیا جائے جو بار بار اور کھلم کھلا اس جذباتی طرز عمل کی تلقین کرتا ہو۔ اگر ایک شخص کسی دین کی سچائی تسلیم کرتا اور اس کے اتباع کا عہد کرتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ دہکتے ہوئے الاؤ کے اندر بھی کود پڑنے میں کوئی پس و پیش نہ کرے۔ اگر اس کے دین کا بالفرض اس سے یہ مطالبہ ہو۔ لیکن اگر وہ اس کے مطالبات کو سن کر ٹال دیتا ہے اور انہیں جذباتی۔ دوسرے لفظوں میں ناقابل عمل اور غیر معقول خیال کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ فی الواقع اس کا اس پر ایمان ہی نہیں، اس کا ایمان اگر ہے تو اپنی عقل و فہم پر ہے۔ اس لیے ایمان داری کا تقاضا یہ ہے کہ اس دین کے نام سے اصول و مسائل پر بحث کرنے سے پہلے وہ اپنی پوزیشن کی تعیین کر لے۔

لیکن کیا واقعتہً یہ بات جذباتی ہی ہے اور اس مطالبے کی بنیاد نرے جذبات ہی پر ہے؟ نیز کیا جذبات کی ہماری عملی زندگی میں کوئی اہمیت اور ضرورت بالکل ہے ہی نہیں؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کے بارے میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پچھلے صفحات میں جو بحثیں کی جا چکی ہیں ان میں اس خیال کی تردید کا پورا پورا مواد موجود ہے۔ رہ گیا دوسرا سوال تو تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اس کا جواب بھی آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ جائزہ لے کر دیکھئے کہ دنیا میں بڑی بڑی مہمیں کس طرح سر کی جایا کرتی ہیں؟ آیا محض نظری فلسفوں ہی سے؟ یا جذبات کی مدد بھی ضروری ہوتی ہے؟ یہ جائزہ یقیناً آپ کو اس نتیجے پر پہونچائے گا کہ کسی بھی بڑے کام میں کامیابی کا انحصار عقل اور جذبات دونوں پر ہوتا ہے۔ اس میں جس طرح عقل و تدبر کے ٹھنڈے فلسفوں سے بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی اسی طرح جذبات کی گرم لہروں سے بھی بے نیازی ممکن نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دونوں کے وظائف الگ الگ ہیں۔ اس لیے اگر وہ کام جو عقل کے کرنے کا ہے جذبات کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تو اس کا نتیجہ یقیناً ناکامی ہی کی شکل میں نمودار ہوگا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کسی مقصد کی تعیین تو صرف عقل ہی کرتی ہے۔ یہ عقل ہی کا کام ہے کہ پوری پوری چھان بین کر کے بتائے کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں؟ پھر یہ کہ کرنے کے کاموں میں سے کون سے کام صرف بہتر ہیں اور کون سے ضروری؟ نیز جو ضروری ہیں ان کے مراتب کیا ہیں؟ ان میں سے کس کی حیثیت بنیادی قسم کی ہے اور کس کی غیر بنیادی نوعیت کی؟ جب

اس بارے میں وہ اپنا فیصلہ دے دے تو پھر انسان پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف کاموں کو اپنے پروگرام میں وہی جگہ دے جو اس نے دینے کو کہا ہو، اور اس طرح صرف اسی چیز کو اپنے لیے ضروری یا بنیادی اہمیت کی مالک ٹھہرائے جسے اس کی عقل ایسا ٹھہرا چکی ہو۔ اور اس مسئلے میں اپنے جذبات کو چوں کرنے کی بھی اجازت نہ دے۔ ورنہ اسے بجا طور پر جذباتی اور احمق کہا جائے گا۔ مگر جب عقل اپنا فریضہ انجام دے چکی اور گہرے سوچ بچار کے بعد ایک شئے کو ضروری قرار دے چکی تو اب وہ موقع آجاتا ہے جہاں جذبات کی شرکت اور ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آگے عقلِ محض کے بس کا یہ کام ہے ہی نہیں کہ وہ اس منزل مقصود کی طرف قدموں کو مطلوبہ رفتار سے بڑھا سکے۔ یہ کام وہ اسی وقت انجام دے سکتی ہے جب جذبات کی معاونت بھی حاصل کر لے۔ بل کہ زیادہ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہاں عملی اہمیت کے لحاظ سے جذبات عقل پر بھی مقدم ہو جاتے ہیں۔ معاملہ کے یہاں تک پہنچ چکنے کے بعد اب دراصل یہ جذبات ہی ہوتے ہیں جو دلوں میں عمل کا وہ ولولہ اور قدموں میں حرکت واقدام کا وہ جوش پیدا کرتے ہیں جن کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن ہے۔ یہ جذبات اگر آمادہ کار نہ ہوں تو عمل کی قوتیں سوئی پڑی رہ جائیں گی۔ اور مقصد کی بڑی سے بڑی جاذبیت بھی انہیں جھنجھوڑ کر بیدار نہ کر سکے گی۔ یوں کہیئے کہ عقل صرف سمت سفر معین کرتی اور انجن اور پٹری تیار کرتی ہے۔ اور اس انجن کو حرکت دینے والی اور منزل مقصود تک اسے دوڑا دینے والی اسٹیم یہی جذبات مہیا کرتے ہیں۔ جذبات نے انسانی زندگی کی تعمیر میں اور اہم مقاصد کے حصول میں یہ مقام غاصبانہ طور پر حاصل نہیں کیا ہے بل کہ ان کا یہ ایک فطری حق ہے اور عقل نے اس حق کے تسلیم کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا ہے۔ اس لیے جس طرح مقاصد کی تعیین میں جذبات سے کام نہ لینا عقلیت ہے، اسی طرح ان مقاصد کے حصول میں جذبات سے بیش از بیش کام لینا بھی عقلیت ہی ہے۔ جذباتیت نہیں ہے۔

عقل اور جذبات کے ان الگ الگ وظائف کو سامنے رکھئے اور پھر انصاف سے فیصلہ طلب کیجئے کہ جب عقل نے پورے اطمینان کے ساتھ اسلام کو اللہ کا واجب الاتباع دین مان لیا تو اس کے مطالبات کی تکمیل میں جذبات کی پوری قوت کا لگا دینا آیا جذباتیت ہے یا عقلیت؟ کوئی شبہ نہیں کہ اس کا فیصلہ یہی ہو گا کہ یہ خالص عقلیت ہے۔ لہٰذا اسلام پر ایمان رکھنے اور اقامت دین کو اپنا فریضۂ حیات تسلیم کرنے کے باوجود اس کے لیے اٹھ کھڑے ہونے میں لیت ولعل کرنا دانش مندی نہیں بل کہ دانش فروشی ہے۔ عقل و تدبر کا نام لے کر عقلیت کو رسوا کرنا ہے۔

غلط روی کے اسباب:

بحث کے ان سارے پہلوؤں کے روشن ہو جانے کے بعد ذہن میں قدرتاً ایک بڑا نازک سوال ابھرنے لگتا ہے اور وہ یہ کہ جب بات اتنی واضح تھی تو پھر لوگ حالات کی سازگاریوں اور ناسازگاریوں کی بحث میں کیوں جا الجھے؟ اور امکان و عدم امکان کے اس مسئلے نے ان کے ذہنوں میں کہاں سے بار پالیا، جس کے نتیجے میں وہ اپنے فریضۂ حیات سے یوں بے تعلق ہو کر رہ گئے۔ حقیقت کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، مگر جہاں تک انسانی فہم کی رسائی کا تعلق ہے یہ غلط روی بظاہر دو باتوں کے نہ سمجھ پانے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے:۔

ایک[1] تو یہ کہ اقامت دین کے فریضۂ حیات ہونے، اور پھر اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے کے اصل معنی کیا ہیں؟

دوسری[2] یہ کہ اس فریضے کی خاطر کی جانے والی جدوجہد میں کامیابی کا واقعی مفہوم کیا ہے؟ اس لیے اگر ان دونوں باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے اور ذہن کو ٹھیک اس سانچے میں ڈھال لیا جائے جو قرآن عطا کرتا ہے تو پھر نہ حالات کی ناسازگاریوں کا کوئی سوال باقی رہے گا، نہ امکان اور عدم امکان کی بحث پیدا ہو گی۔

مومن کی اصل ذمے داری:

جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی اقامت اہل ایمان پر فرض ہے تو اس کا مطلب غالباً یہ لے لیا جاتا ہے کہ زمین پر اسلامی نظام زندگی کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینے کو ہمارا فرض کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ صریح غلط فہمی ہے۔ ہم پر تو جو چیز فرض ہے اور جس کی ہم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں پرسش ہو گی، وہ دین کو بالفعل قائم کر دینا نہیں ہے۔ بل کہ اس کو قائم کر دینے کی اپنی پوری طاقت سے جدوجہد کرنا ہے۔ جس نے یہ کر لیا وہ اپنے فرض کو پورا کر گیا اگرچہ ایک شخص نے بھی اس کی بات نہ مانی ہو، اور ایک ذرۂ زمین پر بھی وہ دین حق کو قائم نہ کر پایا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ اٹھا سکتا ہے...... (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) اس نے کسی پر کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں سے زیادہ ہو۔ مثلاً اس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ ہم اس کا تقویٰ اختیار کریں۔ مگر اس کا یہ مطالبہ ہماری واقعی سکت سے بڑھ کر نہیں ہے۔ بل کہ اسی حد تک ہے جو کہ ہماری خلقی استطاعت کے بس میں ہو، چنانچہ وہ فرماتا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن:١٦)

"اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ جس قدر تم کر سکتے ہو۔"

یا مثلاً مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اعدائے دین کا مقابلہ کرنے اور ان کا زور توڑ ڈالنے کے لیے تیار رہیں۔ مگر اس کے لیے ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو دشمنوں کی قوتِ جنگ کے برابر قوت لازماً فراہم کریں۔ بل کہ صرف یہ کہا گیا ہے، اور اتنا ہی ان پر واجب کیا گیا ہے کہ:۔

اَعِدُّوْا لَھُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّۃٍ. (الانفال:٦٠)

"دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اتنی قوت تیار کر رکھو جتنی کہ کر سکتے ہو۔"

اسی طرح نبی ﷺ سے جب لوگ اطاعت کی بیعت کرتے تو آپ ان کے الفاظ بیعت میں خود اپنی طرف سے تاحدِ استطاعت کی قید بڑھا دیتے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں:۔

كُنَّا نُبَايِعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَعَلَى السَّمْعِ وَالْطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتُ (مسلم: جلد دوم)

"ہم نبی ﷺ سے سمع و طاعت کی بیعت کرتے تو آپؐ فرماتے کہ یہ بھی کہو کہ جہاں تک میری طاقت میں ہو گا۔"

غرض دین کا یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی بجا آوری کا جو مطالبہ فرمایا ہے وہ انسان کی واقعی طاقت کی حد ہی تک کا ہے، اس سے زیادہ کا قطعاً نہیں ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اقامت دین کے معاملے میں بھی اس اصول کا لحاظ نہ ہو۔ یقیناً ہو گا۔ اور اس کام میں حالات کی ناسازگاریاں، ماحول کی دقتیں اور ذرائع کی کمیابیاں جس قدر مزاحم ہوں گی، اسی قدر ہمیں اللہ تعالیٰ کی جناب سے رعایت بھی ضرور ملے گی۔ اسی طرح مختلف افراد کے حق میں ان موانع کی نوعیتوں کا جو تفاوت ہو گا، اس تفاوت کا بھی پورا پورا لحاظ فرمایا جائے گا اور ہر فرد کو اس کے دربار عدل میں صرف اسی حد تک جواب دہی کرنی پڑے گی جس حد تک کہ اسے جدوجہد کی طاقت میسر ہے۔ اگر ایک شخص کو کام کے اچھے ذرائع اور ماحول کی سازگاریاں حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مقدور بھر قیامِ دین کی کوشش بجا نہیں لاتا تو لازماً ادائے فرض میں کوتاہی دکھانے کا مجرم قرار پائے گا۔ خواہ اپنی اس کم توجہی کے باوجود وہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے کتنا ہی آگے

کیوں نہ نکل گیا ہو۔ اس کے بخلاف اگر دوسرے شخص نے اپنی تمام ممکن کوششیں صرف کر ڈالیں لیکن ذرائع کے ناپید اور حالات کے ناساز گار ہونے کے باعث آخر تک کچھ نہ کر پایا، اور بس منزل مقصود کی سمت اپنا رخ جمائے وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا جہاں سے اس نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا تھا تو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ ہر طرح اپنے فرض کو ادا کر گیا اور اللہ کے حضور اس پر کوئی الزام نہ لگے گا۔ اس لیے مومن کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ جیسی کچھ اسے طاقت حاصل ہو اور جس طرح کے حالات میں وہ ہو، انہی کے مطابق اپنی کوششیں انجام دیتا رہے۔ پھر جیسے جیسے ان حالات میں تغیر ہوتا، اور اس کی اپنی قوت کار میں فرق آتا جائے اپنی جدوجہد کا دائرہ بھی اسی کی مناسبت سے تنگ یا وسیع کرتا رہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے، نماز ہم پر فرض ہے جس میں قیام، رکوع اور سجدہ وغیرہ چند چیزوں کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک شخص اگر قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو۔ لیکن دو رکعتیں پڑھ چکنے کے بعد اس کی یہ مجبوری دور ہو جاتی ہو۔ اور اب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو تو اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ باقی رکعتیں وہ کھڑے ہو کر ہی پڑھے، اور جیسے ہی اسے اپنے عذر کے جاتے رہنے کا احساس ہو جائے فوراً اٹھ کھڑا ہو۔ ٹھیک یہی حال اقامت دین کی جدوجہد کا بھی ہے۔ جس شخص کو جس وقت جتنی قوت میسر ہو۔ اس وقت اتنی ہی جدوجہد اس کے لیے ضروری ہے۔ نہ اس سے زیادہ کا وہ مکلّف ہے نہ اس سے کم میں اس کی خیر ہے۔ زمین پر مکمل طور پر اللہ کے دین کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا۔ ایک آخری غایت (گول) ہے جہاں تک پہونچنے کی مسلسل کوشش مسلمانوں کی منصبی ذمہ داری ہے اور جہاں تک پہونچ جانا ہر مسلمان کی لازماً ایک محبوب آرزو ہونی چاہیے۔ مگر وہاں بہر صورت پہونچ جانا اس پر واجب ہرگز نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اس پر جو کچھ واجب قرار دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس گول کی طرف اتنے قدم آگے بڑھتا جائے جتنے قدم کہ وہ فی الواقع آگے بڑھ سکتا ہے۔

واقعی ناکامی کا عدم امکان:

جب اقامت دین کے فرض ہونے کا مدعا یہ ہے تو یہیں سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ اس فریضے کی خاطر کی جانے والی جدوجہد میں کامیابی کا واقعی مفہوم کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ جب اپنی استطاعت کے مطابق ہی کوشش کرنے کے ہم مکلّف ہیں تو پھر اس کوشش کے بعد اس

راہ میں ناکامی کا کیا امکان باقی رہ سکتا ہے؟ یہ تو وہ راہ ہے جو خود ہی راہ بھی ہے اور خود ہی منزل بھی۔ دنیا کی دوسری تمام تحریکوں اور سرگرمیوں کا معاملہ تو ضرور ایسا ہے کہ ان میں پوری پوری کوشش کے باوجود کامیابی کا بھی امکان ہوتا ہے اور ناکامی کا بھی۔ لیکن اقامت دین کی جدوجہد ایک ایسی جدوجہد ہے جس میں اگر پوری پوری کوشش انجام دے دی گئی تو پھر ناکامی کا کوئی امکان باقی ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ مومن سے اس کے رب کا مطالبہ اس سے زیادہ کا ہے ہی نہیں کہ بس وہ اپنی طاقت اس کام میں لگادے، اور اپنی آخری سانس تک لگائے رکھے۔ کل اس سے حساب بھی صرف اسی بات کا لیا جائے گا۔ جس میں اگر ثابت ہو گیا کہ اس کا عمل ایسا ہی کچھ رہا ہے تو رضائے الٰہی اس کے لیے اپنی آغوش کھول دے گی اور آخرت کی فلاح سے وہ بہر حال شاد کام ہو کر رہے گا۔ اس لیے اس نے جب دنیا میں اس کوشش کا حق ادا کر دیا تو اپنی زیست کا مقصد اور اپنے ایمان کا بنیادی تقاضا بھی پورا کر گیا۔ تو کیا اپنی زیست کے اصل مقصد اور اپنے ایمان کے بنیادی تقاضے کو پورا کر دینے کے سوا بھی کوئی چیز ہے جس کی تعبیر کے لیے کامیابی اور بامرادی کے الفاظ محفوظ کر لیے جانے چاہئیں؟

ہاں اس راہ میں ایک ناکامی ضرور ہے اور وہ یہ کہ اپنی قوتوں کو اس میں خرچ کرنے سے دریغ کیا جائے، اور اپنی استطاعت کے مطابق کلمۂ حق کی سربلندی میں سعی نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ اس میں کسی ناکامی کا کوئی خدشہ ہی نہیں۔ مومن اپنی قوتیں میدان سعی و جہد میں ڈال دینے کے بعد جس انجام سے بھی دوچار ہوتا ہے وہ بہر حال کامرانی کا انجام ہے، مایوسی و نامرادی کے نام سے بھی اس کی جدوجہد آشنا نہیں۔

کامیابی کا اسلامی تصور:

اس بارے میں جو چیز مسلمانوں کی نگاہوں کا حجاب بن گئی ہے وہ دراصل اشیاء کی قدریں متعین کرنے کا وہ مادی اصول ہے جو آج ہر طرف ذہنوں پر چھایا ہوا ہے لیکن جس کو قرآن مٹانا چاہتا ہے۔ آج مسلمان بھی کسی چیز کے ردو قبول میں اسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج کو اور اسی زندگی کے نفع و نقصان کو سامنے رکھنے لگا ہے، اسی لیے وہ اس کوشش کو لاحاصل اور ناکام سمجھتا ہے جس میں کوئی فوری اور مادی فائدہ ظاہر ہوتا ہوا دکھائی نہ دے۔ حالانکہ قرآن نے اسے ترک و اختیار کی بنیاد اور کامیابی کا مفہوم کچھ اور ہی بتایا ہے۔ اس کے نزدیک مسلمان کی پہچان ہی یہ تھی کہ وہ آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دینے والا ہوتا ہے اور اپنی کامیابی صرف اس بات میں سمجھتا

ہے کہ اپنی ساری پونجی قیام حق کی راہ میں لگادے۔ اس کے بعد اگر وہ پہلے ہی قدم پر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو بھی، اور اگر سارے عالم پر دین حق کا جھنڈا لہرا دیتا ہے تب بھی، ہر حال میں کامیاب ہی کامیاب ہے۔ ضرورت ہو تو قرآن کی واضح شہادت بھی سن لیجیے:۔

منافقوں کی تمنا بھی تھی اور توقع بھی کہ اب جو رومؔ کے افق سے طوفان جنگ نمودار ہو رہا ہے وہ ان مٹھی بھر سر پھرے مسلمانوں کو، جو تمام دنیا کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں، پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اور ان کے پرخچے اڑا کر رکھ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ:۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ. (التوبہ: ۵۲)

"(ان منافقوں سے) کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں جس بات کا انتظار کرتے ہو وہ ہمارے لیے دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہی تو ہے۔"

یہ آیت جو کچھ کہہ رہی ہے اسے غور سے سن رکھئے۔ یہ صاف اعلان کر رہی ہے کہ جس طرح مسلمانوں کا میدان جنگ جیت جانا ان کے لیے بھلائی اور کامیابی ہے اسی طرح ان کا ہار جانا اور جاں بحق ہو جانا بھی بھلائی اور کامیابی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی فتح بھی "حسنیٰ" ہے اور ان کی شکست بھی۔ گویا ایک مرد مومن جب جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو ہر صورت میں تمغۂ کامرانی ہی لیے کر لوٹتا ہے، بے شک یہ کامیابی بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنی تلوار سے دشمنوں کو زیر کر لے اور حق کا بول بالا کر دے۔ لیکن دوسری صورت حال کو بھی ناکامی نہیں کہا جا سکتا۔ بل کہ اگر وہ اور اس کے تمام ساتھی خدانخواستہ لڑائی میں قتل ہو جائیں تو ایک مومن کے حقیقی مطمح نظر کے لحاظ سے یہ بھی اسی کے ہم پلہ ایک کامیابی ہے۔ قابل صد رشک کامیابی، جس پر دنیا کی ساری کامیابیاں قربان ہو جائیں جس سے بڑی کامیابی کی آرزو ہی نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک جزئی مثال تھی جس کا تعلق مومن کی ایمانی زندگی کے صرف ایک مخصوص گوشہ سے ہے۔ اسی جزو سے کل کی طرف آیئے۔ اور اسی فرع کو اصل بنا کر مومن کی پوری ایمانی زندگی اقامت دین کی جدوجہد۔ پر پھیلا دیجیے۔ پھر معلوم ہو گا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جن کو اسی جدوجہد کے جرم میں دار پر لٹکا دیا گیا تھا اور جو ایک بالشت زمین پر بھی دین حق کا نفاذ نہ کر سکے تھے، اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ٹھیک اسی طرح دنیا سے کامران و بامراد تشریف لے گئے جس طرح کہ محمد

رسول اللہ ﷺ، جنہوں نے ایک وسیع خطہ ارض پر عملاً اللہ کا دین قائم کر دیا تھا۔ مگر اس کھلے راز کو بھی سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے مومن کا دل چاہیے۔ عقل مصلحت پرست کے اندر یہ "جذباتی" باتیں کہاں سما سکتی ہیں۔

عملاً قیام دین کے روشن امکانات:

لیکن کامیابی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے اس کے لحاظ سے بھی یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج کی دنیا میں اس جدوجہد کی ناکامی کی بہ نسبت اس کی کامیابی کا امکان زیادہ ہے۔ اگر امت مسلمہ کا دسواں بیسواں حصہ بھی اپنے اس فریضے کی انجام دہی میں دل و جان سے لگ جائے اور ٹھیک اس طریقے سے لگ جائے جس کا اس کا مزاج تقاضا کرتا ہے۔ اور جس کی کتاب و سنت اور اسوۂ انبیاء سے ہدایت ملتی ہے، تو اس کوشش کا بار آور ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح اندھیری رات کے بعد چمکتے ہوئے سورج کا نکلنا یقینی ہوتا ہے۔ اس دعوے کی حقانیت آپ پر بڑی آسانی سے واضح ہو جائے گی۔ اگر ان چیزوں پر، اور ان کے تقاضوں پر اچھی طرح غور کر لیں:۔

(۱) اقامت دین کے مخاطب اور ذمے دار گروہ کی خاص نوعیت۔

(۲) انسانی فطرت کی اصل پسند۔

(۳) انسان کا موجودہ فکری، عملی، اور تمدنی ارتقاء اور اس ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی بے چینی۔

عموماً لوگ کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگاتے وقت پہلے ہی قدم پر ایک عظیم الشان حقیقت فراموش کر جاتے ہیں، اور وہ یہ کہ یہ کام کسی بے اصول، خود غرض، تھڑدلے اور پست نظر گروہ کے سپرد نہیں ہے بل کہ ان لوگوں کے سپرد ہے جو مومن ہونے کا دعوی رکھتے ہیں۔ یعنی جو قرآنی بیانات کے مطابق ایک خدا پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں اور اس کے سوا کسی کو پرستش اور رضا جوئی کا حق دار، حقیقی اطاعت کا سزاوار اور طاقت و اقتدار کا مالک نہیں سمجھتے جو محمد ﷺ کو اپنا ہادی مانتے ہیں، اور اپنی زندگی کے کسی شعبے میں ان کے سوا کسی کو قابل اتباع نہیں تسلیم کرتے، جو آخرت کو دنیا پر ہمیشہ مقدم رکھتے ہیں، جو نماز، روزے، اور حج و زکوٰۃ وغیرہ عبادات کے بجالانے والے ہوتے ہیں، جو حق کے شاہد، سچائی کے مجاہد، معروف کے مبلغ، عدل کے علمبردار، باطل کے حریف، منکر کے فطری دشمن، جھوٹ سے متنفر اور ظلم سے مجتنب ہوتے ہیں۔ جن کی پہچان یہ ہے کہ وہ برائی کو نیکی سے اور جہالت کو شرافت سے مٹائیں، جن کا شعار یہ

ہے کہ وہ انصاف پر قائم رہیں اگر چہ اس کی زد خود ان کے اپنے ہی اوپر کیوں نہ پڑتی ہو، جن کا شیوہ یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی زیادتی کا سلوک نہ کریں اگر چہ کتنے ہی مظالم ان کے ہاتھوں جھیل چکے ہوں، جو ہر حال میں راستی پر قائم رہتے ہیں۔ اگر چہ تمام دنیا ہاتھ سے نکلی جاتی ہو، جو دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے اور دوسروں کی جان ومال کو حرمت کعبہ کا مستحق باور کرتے ہیں، جو غیر کے لیے بھی وہی پسند کرتے ہیں جو اپنے لیے کرتے ہیں، جن کے دامن یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کے لیے امن وسلامتی کی پناہ گاہیں ہوتی ہیں۔ غرض جن کی زندگی اور جن کی موت، جن کی محبت اور جن کی عداوت، سب اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ اب اگر دنیا میں "مومنوں" کا کوئی گروہ موجود ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی نہ کسی حد میں یہ صفات بھی اپنے اندر ضرور رکھتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جب قیام دین کے امکانات کا جائزہ لیا جائے تو اسی گروہ اور اس کی انہی صفات کو سامنے رکھ کر لیا جائے۔ یہ نکتہ اگر نظر انداز ہو گیا تو ہرگز صحیح نتیجے پر نہیں پہنچا جاسکتا۔ اور اگر یہ نظروں کے سامنے رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ ناممکن کا لفظ پھر بھی منہ سے نکل سکے۔ غور تو کیجیے، جو گروہ ایسے ایمانی اور اخلاقی اسلحوں سے مسلح ہو اس کے بارے میں یہ بدگمانی اور مایوسی کیسے کی جاسکتی ہے کہ اس کے ہاتھوں دین قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس کی عددی کثرت بھی غیر معمولی حد تک زیادہ ہو، اور دنیا کی کسی اور پارٹی کے ممبروں کی تعداد اس کی آدھی تہائی بھی نہ ہو؟ یہ صحیح ہے کہ آج یہ بھاری گروہ جن افراد پر مشتمل ہے ان کی بہت بڑی اکثریت ان مذکورہ بالا صفات سے تہی دامن ہو چکی ہے۔ مگر یہ کسی طرح صحیح نہیں کہ اس گروہ میں ایسے لوگ باقی ہی نہیں رہے جن میں یہ صفات موجود ہوں، نہیں، اب بھی ایسے لوگ نایاب نہیں ہیں البتہ کم یاب ضرور ہیں۔ اگر خاکستر کی ان چنگاریوں کو دنیا میں اجالا پھیلانے کا خیال اور بھڑکنے کا ڈھنگ آجائے تو یہ اندھیرے سنسار کو ایک دن جگمگا کر دم لیں گی۔

اب انسانی فطرت[۲] کو لیجیے۔ انسان اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے اور ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر عام افرادِ انسانی نیکی کی مقناطیسیت سے کھنچ اٹھنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ خالص باطل پرست اور شر پسند لوگ جو اس حالت کو دراصل اپنی فطرت کو مسخ کر لینے سے پہونچ جاتے ہیں دنیا میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ البتہ جب یہی گنتی کے شیطان انسانی زندگی کی اجتماعی مشینری پر قابض ہو جاتے ہیں اور قوموں کی زمام قیادت ان کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے تو عام لوگ محض ان کے پیچھے چل پڑنے کی وجہ سے برائی کی نجاستوں میں لتھڑ جاتے ہیں۔ مگر اس

کے باوجود خیر پسندی کا فطری ذوق ان کے اندر سے فنا نہیں ہو جاتا۔ اس لیے اگر نظری اور عملی دونوں طریقوں سے نور حق ان کے سامنے بے حجاب کر کے چمکا دیا جائے تو ان میں سے کچھ تو اس کی طرف عملاً بھی لپک پڑیں گے، اور دوسروں میں اگر اتنی جرأت نہ ہو گی تو اتنا ضرور ہی ہو گا کہ وہ اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ عام انسان اس چیز کو اس کی اپنی صحیح شکل میں دیکھ لینے کے بعد بھی رد کر دے جو اس کی فطرت کو مطلوب ہے اور اس چیز سے بدستور لپٹا رہے جس سے اس کی اصل فطرت ہم آہنگ نہیں۔

آخری[۱] قابل لحاظ چیز، جسے اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، زمانے کا ارتقائی رجحان اور انسان کی ذہنی بے چینی ہے۔ پچھلے زمانوں میں ایک تو انسانی فکر اپنی پختگی کو پہونچی نہیں تھی، دوسرے لوگوں میں گروہی اور مذہبی عصبیتیں حد سے زیادہ ہوتی تھیں اور وہ اپنے دلوں کے دروازے بیرونی آواز کے لیے مضبوطی سے بند رکھتے تھے، تیسرے تبلیغ واشاعت کے ذرائع نہایت محدود تھے۔ ان اسباب کی بنا پر دین حق کی تبلیغ کے ظاہری نتائج اکثر ناکامی کی شکل میں نمودار ہوا کرتے تھے۔ مگر اب حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ انسان تحکمی عقائد کی اندھی پیروی اور اوہام پرستی سے اونچا اٹھ رہا ہے اور روز بروز حقائق پسندی کی طرف آ رہا ہے۔ عقلیں ان اصول و نظریات کو چھانٹ کر دور پھینکتی جا رہی ہیں جو انسانی زندگی کے مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغربی تہذیب نے جہاں دنیا کو بے شمار نقصانات پہونچائے ہیں وہیں وہ ایک ایسی کیفیت بھی ذہنوں میں پیدا کر گئی ہے جس سے ایک ایسا دین عظیم الشان فائدے حاصل کر سکتا ہے جو مسائل زندگی کا صحیح، متوازن اور اطمینان بخش حل پیش کر سکے۔ اس تہذیب نے ان اوہام کی بہت کچھ بنیاد ڈھا دی ہے جو انسانی دماغ کا پردہ بنے ہوئے تھے۔ ان اوہام کے ڈھ جانے کے ساتھ ہی ان مذاہب کی چھتیں بھی زمین پر آ گئی ہیں جن کی تعمیر ان اوہام پر ہوئی تھی، اور جو صرف جذباتی عصبیتوں کے حصار ہی میں جی سکتے تھے۔ اس تہذیب کا جنم دراصل ایک فکری انقلاب کا نتیجہ تھا۔ ایک تو انقلاب کی فطرت ہی بحرانی ہوتی ہے۔ دوسرے جہاں تک خاص اس انقلاب کا تعلق ہے اسے صحیح رخ پر موڑنے کی کوئی کوشش بھی نہ ہوئی۔ بل کہ اس کا راستہ روکا گیا اور وہ بھی نہایت بھونڈے بل کہ احمقانہ طریقے سے، اس لیے وہ اپنے جوش میں اوہام کے ساتھ بہت سے حقائق بھی بہا لے گیا اور دیگر مذاہب کی طرح خود اسلام کو بھی چیلنج کر گیا جو اپنی فطریت اور عقلیت کی وجہ سے اس کا صحیح رہنما ہو سکتا تھا۔ مگر اس بے اعتدالی کے بکثرت تلخ نتائج اب اس کے

علمبرداروں کے سامنے آچکے ہیں۔ اس لیے وہ اعتدال کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس انقلاب نے ذہنوں میں جو بھونچال پیدا کر دیا ہے اس نے جاہلانہ مذہبی عصبیتوں کی بندشیں بڑی حد تک ڈھیلی کر دی ہیں۔ اور ایسے بے شمار افراد پیدا کر دیئے ہیں جو کسی بات کو صحیح سمجھ لینے کے بعد اسے تسلیم کر لینے کے میں اپنے روایتی معتقدات کو مانع نہیں پاتے۔ پھر فکر کی اس آزادی اور ذہن کی اس بے تعصبی کے علاوہ وقت کے تمدنی، معاشی اور سیاسی حالات نے بھی اسلام کے لیے بہت کچھ زمین ہموار کر دی ہے۔ جب سے نظام عالم کی سیاسی باگ ڈور فاسق و فاجر اور خدا سے باغی ہاتھوں میں آئی ہے اور انہوں نے ہدایت الٰہی کو پس پشت ڈال کر زندگی کے نظام کو اپنے من مانے اصولوں پر چلانا شروع کیا ہے اس وقت سے نوع انسان برابر اپنی خودسری کے برے نتائج بھگتتی چلی آ رہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی دماغ کے بنائے ہوئے تمام نظام ہائے زندگی ایک ایک کر کے ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ناکام ثابت ہو چکے ہیں بل کہ ان کی پیدا کی ہوئی پیچیدگیوں اور ان کے نازل کی ہوئی ہلاکتوں سے دنیائے انسانیت چیخ اٹھی ہے اور بڑی بے تابی سے ایک ایسے نظام حیات کی فی الواقع طلب گار ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا کر سکے۔

صورت واقعہ کے ان تینوں روشن پہلوؤں کو نگاہ میں رکھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ دین کا قیام ممکن ہے یا ناممکن؟ کیا یہ صورت واقعہ ڈرنے، سہمنے، اور مایوس ہونے کی ہے؟ اگر نہیں، تو وہ لوگ کیوں نہ پورے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھیں، جو ایک طرف تو اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ پورا حق صرف اسلام کے پاس ہے اور زندگی کے مسائل کا صحیح اور تسلی بخش حل اس کے سوا اور کہیں ہے ہی نہیں، دوسری طرف انہیں اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انسان بھلائی کا فطری طلب گار اور خدا کی بہترین مخلوق ہے۔ پیدائشی مجرم اور بدی کا پجاری نہیں ہے۔ البتہ ان لوگوں سے ــــ اس طرح کے کسی اقدام کی توقع رکھنا ضرور غلط ہو گا، جن کے اندر کا یہ "یقین" رسمی عقیدت کی حدوں سے آگے نہ بڑھا ہو۔ کیونکہ ایسے "اہل ایمان" خواہ اسلام کے ان فضائل و محامد کا کیسے ہی فخر اور جوش سے اظہار کرتے ہوں اور اس کی شان میں کیسے ہی عمدہ قصیدے پڑھتے ہوں، چوں کہ ان کی ان مدح سرائیوں کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں نہیں ہوتیں اس لیے وہ عمل و اقدام کے پھل بھی نہیں دے سکتیں۔ ایسے لوگ اگر خدا کے دین سے مایوس ہوں تو انہیں مایوس ہونا ہی چاہیے۔ اور خود یہ دین بھی ان سے مایوس ہی ہے۔ مگر ان لوگوں کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں جو دین حق کی ان خوبیوں اور صلاحیتوں پر اپنی عقل اور بصیرت کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔ وہ

جانتے ہیں، اور اگر نہیں جانتے تو انہیں جاننا چاہیے کہ دنیا کے عام حالات اور انسانی حقائق آج اسلام کے حق میں ہیں۔ آگے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جو فکری اور عقلی طاقت انہیں حاصل ہے اسے وہ اسی کام پر مرکوز کر دیں کہ یہ دنیا بہر حال اسباب کی دنیا ہے۔ یہاں جو کام بھی انجام پاتا ہے اپنے مقررہ طرز ہی پر انجام پاتا ہے۔ آپ کے اپنے دستر خوان کا لقمہ بھی آپ کے منہ میں نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کے لیے آپ اپنے ہاتھ کو حرکت نہیں دیتے۔ اس لیے حالات کسی نصب العین کے حق میں کیسے ہی سازگار کیوں نہ ہوں، وہ کامیابی کی منزل پر اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کے لیے ضروری تدبیریں اور مطلوبہ کوششیں زیر عمل نہ لائی جاچکیں۔ اقامت دین کا نصب العین بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس لیے ان تمام روشن پہلوؤں کے باوجود، جن کا ابھی تذکرہ کیا جاچکا ہے، اس مقصد میں کامیابی اسی وقت ہو سکے گی جب کہ اس کے لیے مناسب تدبیریں اور مطلوبہ کوششیں اختیار کر لی جائیں۔

یہ تدبیریں اور کوششیں کیا ہیں؟ ان کو دو لفظوں میں اسلام کے فکری[1] اور عملی[2] "شہادت" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے:۔

فکری[1] شہادت تو یہ ہے کہ اسلام کا بیسوی صدی کی زبان میں تعارف کرایا جائے اور آج کے ذوق و ذہن کو اپیل کرنے والے طرز استدلال سے اسے مدلل کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اس نے جو ہدایات و احکام دیئے ہیں انہیں زمانۂ حال کی تعبیروں میں ڈھال کر لوگوں پر واضح کر دیا جائے کہ انسانی مسائل کا صحیح حل اور تمدن عالم کی صحیح رہنمائی صرف انہی ہدایات میں مضمر ہے۔

عملی شہادت[2] یہ ہے کہ عمل کی زبان سے بھی اس پر اپنے یقین کا اظہار کیا جائے اور مشکل سے مشکل مواقع میں بھی اس کی راہ راست سے قدموں کو ہٹنے نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔ عبادتوں میں وہ روح پیدا کی جائے جس سے دلوں میں زندگی اور سیرتوں میں پاکیزگی آتی جائے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے معاملات میں اسلامی اخلاق کی پوری پابندی کی جائے۔ قومی، وطنی، نسلی، خاندانی، طبقاتی اور ذاتی مفادات سے آنکھیں بند کر کے اصلاً صرف اسلام کے مفاد کو سامنے رکھا جائے۔ ظلم کا جواب عدل اور عفو و درگذر سے، بدی کا جواب نیکی سے، جھوٹ کا جواب سچ سے، اور بے اصولی کا جواب اصول پسندی سے دیا جائے کہ یہ سعی و جہد صرف اس مسلک حیات کی تبلیغ و اقامت کے لیے ہے جس پر ساری انسانیت کی فلاح

موقوف ہے، اور پھر اس سعی وجہد میں حسب ضرورت اپنے عیش و آرام کو خیر باد کہنے، اپنی آرزوؤں کو پامال کرنے اور جانی ومالی قربانیاں دینے میں کم از کم اتنی ہی پامردی دکھائی جائے جتنی کہ لینن اور اسٹالن کے ساتھیوں نے کمیونزم کی اقامت میں، نازیوں نے نازیت کی حمایت و سربلندی میں اور جاپانیوں نے میکاڈو کی رضاجوئی میں ابھی پچھلے دنوں دکھائی ہے۔

اگر فکری اور عملی شہادت کا یہ فریضہ انجام دے دیا گیا۔ جو دیا یقیناً جاسکتا ہے ۔ تو حق کی ساحرانہ قوت تسخیر کا دعویٰ ہے اور خدا کی سنت اس دعوے کی گواہ ہے کہ ایک دن یہ جدوجہد کامیاب ہو کر رہے گی۔ ذہنوں کی گرہیں کھل جائیں گی۔ دل اس کی طرف کھنچ آئیں گے۔ آنکھیں اس کے سامنے فرط عقیدت سے جھک پڑیں گی۔ اور دنیا پھر سے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا روح پرور منظر دیکھ لے گی۔

ہم جانتے ہیں کہ آج خدا کی زمین پر باطل کی مضبوط گرفت قائم ہے، مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ باطل اپنے ابدی اقتدار کا وثیقہ لے کر نہیں آیا ہے نہ وہ اس زمین کا جائز وارث ہے۔ قدرت نے زمین کو اصل مسکن، حق کا بنایا ہے باطل کا نہیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ جب حق اپنے علمبرداروں کی غفلت اور فرض ناشناسی کی وجہ سے اپنے اس گھر کو چھوڑ دیتا ہے تو باطل کا دیو اسے خالی پاکر اپنا قبضہ جمالیتا ہے۔ کیونکہ اس گھر کے بنانے والے نے اس کے لیے ضابطہ ہی یہ بنایا ہے کہ وہ کبھی بے آباد نہ رہے۔ اس لیے اگر وہ اپنے اصل حقدار سے آباد نہیں رہ جاتا تو ناچار غاصب ہی کے لیے اپنے دروازے کھول دیتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر فطری صورت حال ہوتی ہے جسے یہ گھر مجبوراً ہی گوارا کرتا رہتا ہے۔ اس لیے جب بھی اس کا اصل مکین اپنا قبضہ واپس لینے پر تل جاتا ہے تو قدرت کے مضبوط ہاتھ اس غاصب کو نکال کر لازماً باہر کر دیتے ہیں۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے جس کی بنیاد کسی خوش گمانی پر نہیں بل کہ قرآن حکیم کے محکم بیان پر ہے۔ اس نے فرمایا ہے:۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل:۸۱)

"حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ بلاشبہ باطل مٹنے ہی والی چیز ہے۔"

معلوم ہوا کہ باطل کی زندگی صرف حق کی غیر موجودگی تک ہے۔ جب حق آئے گا ــ آئے گا نہیں بل کہ یوں کہیے کہ جب لانے والے اسے لائیں گے ــ تو باطل خود جگہ چھوڑ دے

گا۔ اس لیے یہ گمان کرنا کہ مطلوبہ کوششوں کے باوجود حق کا قیام ممکن نہیں، دراصل اللہ تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار کرنا اور عہدشکنی کا بہتان لگانا ہے۔ جو خدا اس باطل کی خاطر دی ہوئی قربانیوں کو بھی کامیاب بنادیتا ہے جو اسے مبغوض ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حق کی خاطر دی ہوئی قربانیوں کو رائیگاں جانے دے گا، جو اس کو محبوب ہے۔ حالانکہ اس کی طرف سے وعدے پر وعدے بھی کئے گئے ہیں کہ:۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج:۴۰)

"اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔"

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا. (الطلاق:۴)

"جو خدا ترسی کی روش اختیار کرتا ہے خدا اس کے کام میں اس کے لیے آسانی فراہم کردیتا ہے۔"

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ. (الطلاق:۲۔۳)

"جو کوئی خدا ترسی کی راہ چلتا ہے وہ اس کو راستہ مہیا کردیتا ہے۔ اور اسے وہاں سے روزی دیتا ہے جہاں سے (اسے روزی ملنے کا) سان دگمان بھی نہیں ہوتا، اور جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی (ثابت) ہوتا ہے۔"

اور اسی لیے اس سعی وجہد کے نتیجے کے بارے میں اس نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ:۔

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (المائدہ:۵۶)

"سن رکھو! اللہ کی پارٹی ہی غالب رہنے والی ہے۔"

نیز اس نے یہ بات بھی فرمارکھی ہے اور کسی اشارے کنایے کے انداز میں نہیں، بل کہ صریح لفظوں میں فرمارکھی ہے کہ جب یہ پارٹی دشمن کے مقابل ہوتی ہے تو اس کی غیبی نصرتیں اس کی پشت پر ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے بھی اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لیے اتر آتے ہیں۔ اور اس لیے وہ اپنے سے دس گنے دشمنوں پر بھی غالب آکر رہتی ہے۔ بدر، اُحد، احزاب اور حنین کی لڑائیوں میں یہ وعدے واقعہ بن چکے ہیں۔ لہٰذا یقین رکھنا چاہیے کہ جو فرشتے ان میدانوں میں آئے تھے وہ کہیں بھی آسکتے ہیں۔ اور قرآن بتاتا ہے کہ خدا کے بندے اور حق کے مجاہد جب چاہیں انہیں بلاسکتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے واقعات پر تبصرہ کرتے وقت جب اللہ

نے ملائکہ کے اترنے کا ذکر کر کے اپنی غیر معمولی نصرت فرمائی کا تذکرہ کیا تو ساتھ ہی اس خیال کو بھی دور کر دیا کہ ممکن ہے یہ نصرت کوئی وقتی قسم کی اور صرف اسی ایک موقع کے لیے رہی ہو، اور فرمایا:۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّامِنْ عِنْدِ اللّٰهِ "یہ مدد خاص اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔" (الانفال:۱۰)

فرمانے کا مدعا یہ ہے کہ فتح و نصرت خدا ہی کے ہاتھ میں ہے ۔ جس طرح آج ہے کل بھی رہے گی۔ اس لیے اہل ایمان کو یہ تائید و نصرت ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اگر انہوں نے "أنصارُاللہ" ہونے کا حق ادا کر دیا تو اللہ تعالیٰ بھی ان کا "مولیٰ" اور "نصیر" بننے میں دیر نہ لگائے گا۔

یاد رکھیے۔ یہ سب وعدے اور ارشادات اس اللہ کے ہیں جس کے بارے میں مومن کا یہ یقین ہے کہ وہ کبھی غلط وعدہ نہیں کرتا اور جو وعدہ کرتا ہے اسے ضرور پورا کرتا ہے۔ اور اگر کوئی اس یقین سے محروم ہے تو وہ مومن ہی نہیں ---- جھوٹ کہتا ہے اگر اپنے کو مومن کہتا ہے۔ حتیٰ کہ غلط نہ ہوگا اگر اسے انہی پیش روؤں کا "خلف الصدق" کہا جائے جو دین کی راہ میں مشکلات کو دیکھ کر بول اٹھتے تھے کہ، اللہ ہم سے فتح اور غلبے کے وعدے کر کے دراصل دھوکا دے رہا ہے،

مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا (الاحزاب:۱۲)

کیا ان تمام حقیقتوں کے باوجود دین کے قیام کو ناممکن ہی کہا جاتا رہے گا؟ اور کیا ایسا کہنا قلب و نظر کی بے بصیرتی یا پھر ادائے فرض سے بزدلانہ فرار کی دلیل نہیں؟ امکان کامیابی کے ان تمام روشن پہلوؤں کی موجودگی میں بھی اگر کوئی شخص قیام دین کی طرف سے مایوس ہی رہتا ہے تو یقیناً وہ نہ مومن کا کردار ادا کرتا ہے نہ مومنانہ ذہن کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ بھولتا ہے کہ مایوسی ایمان کے نہیں بل کہ کفر کے خصائص میں سے ہے۔ ایسے لوگ حالات کی نام نہاد ناسازگاریوں کو دراصل اپنی فراری روش کا جواز ثابت کرنے کے لیے بہانہ کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں۔ ورنہ انہیں بتانا چاہیے کہ آخر وہ کون سے حالات ہیں جن میں دین اللہ کا قیام و نفاذ ممکن ہوا کرتا ہے؟ یہ تو بالکل ظاہر بات ہے کہ دین حق کو قائم کرنے کی کوشش جہاں بھی اور جس وقت بھی درکار ہوگی وہاں اور اس وقت کوئی نہ کوئی دین باطل بالفعل قائم اور نافذ ضرور ہوگا۔ اس لیے معلوم ہونا چاہیے کہ باطل نظاموں میں سے وہ کون سا "شریف" نظام ہے جو نظام حق کے قیام و نفاذ کے لیے اپنی مملکت از خود چھوڑ دیا کرتا ہے، تاکہ اس کی آمد کا انتظار کیا جائے، اور جب وہ آکر نظام حق کی

تاج پوشی کے لیے دربار حکومت بناسجادے تواس کے ہم "وفادار" خدام، تزک واحتشام سے اسے لے جاکر تخت پر بٹھادیں۔ کیا دنیا کی پوری زندگی میں اس طرح کا کوئی حق نواز باطل کبھی پایا گیا ہے؟ اور کیا دین حق کی اقامت کے لیے جب جب کوششیں کی گئی ہیں اس وقت کے حالات اس کام کے لیے ضرور ہی سازگار تھے؟ اور آئندہ ہمیں بھی ایسے خوش آئند حالات پیدا ہو جانے کی امید ہے؟ مستقبل کے پردے میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے اس کا علم تو خدا ہی کو ہے۔ مگر ماضی کے حالات اور واقعات کے آئینے میں تو صورت واقعہ کا مشاہدہ ہم بھی لے سکتے ہیں۔ ان حالات اور واقعات کا گہری نظر سے جائزہ لیجیے۔ اور پھر بتائیے کہ دینی تاریخ کے اس پورے سلسلے میں جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر ہم تک پہونچتا ہے، اقامت دین کے لیے جتنی کوششیں کی جاچکی ہیں۔ کیا ان سب کے زمانے اس کام کے لیے آج کی بہ نسبت لازماً زیادہ سازگار تھے؟ اس کے ثبوت میں کیا حضرت نوحؑ کے زمانے کا نام لیا جاسکتا ہے جب کہ ساڑھے نو سو سال تک ان پر گالیوں اور پتھروں کی بارش ہی ہوتی رہی تھی؟ یا کیا حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جب کہ نمرود کی "خدائی" قائم تھی۔ اور حضرت ممدوح کو آخر کار انگاروں کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا؟ یا کیا حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ اس خیال کی شہادت بن سکتا ہے جس میں چاروں طرف رومن امپائر کی طاغوتیت چھائی ہوئی تھی اور چند برسوں کے اندر ہی اندر انہیں پھانسی کا حکم سننا پڑ گیا تھا؟ پھر کیا پیغمبر آخر الزماں ﷺ کا زمانہ اس نقطۂ نظر کے حق میں پیش کیا جاسکتا ہے جب کہ خود مرکز توحید تین سو ساٹھ بتوں کا گڑھ اور جاہلیت کی راجدھانی بنا ہوا تھا، اور دعوت حق کا جواب دل آزاریوں اور ایذارسانیوں، کانٹوں اور پتھروں، سماجی بائیکاٹوں اور قتل کے منصوبوں سے دیا جارہا تھا؟ — اگر انبیائی دعوتوں کو کسی تاویل سے اپنے لیے ماورائے مثال قرار دے لیا جائے تو اچھا، ذرا نیچے بھی اتر کر دیکھ لیجئے۔ دیکھئے، یہ مجددؒ الف ثانی کا زمانۂ دعوت ہے۔ اس میں "مسلمان حکومت "اسلام کے خلاف اپنا پورا زور صرف کرتی نظر آرہی ہے۔ اور یہ سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا زمانہ ہے جس میں اہل اسلام کے سینوں پر ایک طرف انگریز اور دوسری طرف سکھ سوار دکھائی دے رہے ہیں اور داڑھیوں تک پر ٹیکس لگا ہوا ہے۔ نام لے کر بتائیے ان زمانوں میں سے کون سا زمانہ ہے جس کو دعوت حق کے لیے موجودہ زمانے سے زیادہ سازگار کہا جاسکتا ہے؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ ان میں سے ہر زمانہ اقامت دین کے لیے اس سے کہیں زیادہ پر خطر اور مایوس کن اور ناسازگار تھا جتنا کہ آج ہے؟ پس اگر ناسازگاریوں کا لحاظ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آغاز

آفرینش سے اب تک ایک فیصدی دور بھی ایسے نہیں آئے بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ کوئی دور بھی نہیں، آیا جو اس جدوجہد کے لیے سازگار تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے سخت زمانوں اور ناموافق حالات میں بھی کتنی ہی کوششیں کامیاب ہوگئیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے دنیا جہان کی ساری ناکامیاں اسی زمانے کے لیے کیوں مقدر مان لی ہیں؟ اور ساری مایوسیوں کو اپنے ہی لیے کیوں مخصوص سمجھ لیا ہے؟

مزید ستم ظریفی یہ کہ "ناممکن" ہونے کا یہ فتویٰ بھی کسی عملی تجربے کی سند کے بغیر ہی دیا جارہا ہے۔ جب اس کام کی خاطر کبھی براہ راست کوشش ہم نے کی ہی نہیں تو آخر کس دلیل کی بناپر یہ ناممکن، ناممکن کا شور کیا جارہا ہے؟ اگر ہم نے فکروعمل کی ساری قوتوں کے ساتھ اور طریقۂ انبیاء کے مطابق، یہ کوشش کرلی ہوتی اور اس کے بعد بھی ساحل مراد دکھائی نہ دیا ہوتا تو بہر حال یہ ایک تجربہ ہوتا جو عدم امکان کے دعوے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا جاسکتا تھا۔ مگر یہ عجیب دھاندلی ہے کہ دریا میں اترتے نہیں، اور دور سے کھڑے کھڑے اس کی گہرائی کے اتھاہ ہونے کا دعویٰ کررہے ہیں۔ یقین فرمایئے جو ذہنیت آج کے حالات کو ناسازگار کہتی ہے اور ان کی موجودگی میں کامیابی کو ناممکن قرار دے رہی ہے، وہ قیامت تک کسی امکان کے پالینے میں ناکام ہی رہے گی۔ اور اس کے لیے کوئی زمانہ ایسا آہی نہیں سکتا جس میں اس جدوجہد کو شروع کیا جاسکتا ہو۔ جس باطل سے آج وہ لرزاں ہے وہی ہمیشہ رہے گا۔ صرف اس کی شکلیں بدلتی رہیں گی۔ مگر قیام حق کے مقابلے میں ہر باطل، باطل ہی ہے، وہ اپنے کسی دور اور اپنی کسی شکل میں بھی حق کو زندگی کا رہنما سمجھنے کا روادار نہیں ہوسکتا اور نہ ٹھنڈے پیٹوں اسے اپنے سامنے پاؤں جمانے کا موقع دے سکتا ہے۔ جب بھی اقامت حق کے لیے جدوجہد کی جائے گی، وقت کا باطل اپنے ہتھیاروں سے مسلح ہوکر لازماً سامنے آئے گا اور اہل حق کو مختلف شکلوں میں وہی تمام زحمتیں، رکاوٹیں، مشکلیں اور مصیبتیں استقبال کے لیے موجود ملیں گی جن کا آج تصور کیا جاسکتا ہے۔ بھولنا نہ چاہیے کہ یہ راہ ہمیشہ خارزاروں اور شعلہ کدوں ہی سے ہوکر گذری ہے۔ اور اب یا آئندہ جب بھی گذرے گی انھی کانٹوں اور انگاروں میں سے ہوکر گذرے گی۔ وہ امکان اور وہ سازگاری جس کی تلاش ہے، اس راہ کے مسافروں کو نہ کبھی ملی ہے نہ مل سکتی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اتنی وضاحت سے بیان کردیا ہے کہ غلط فہمی یا خوش گمانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ بار بار فرماچکا ہے کہ ایمان کو طرح طرح کی آزمائشوں سے جانچا پرکھا جاتا ہے، اور اللہ کے حضور وہ اس وقت تک مقبول نہیں

ٹھہرتا جب تک کہ وہ اس بھٹی میں تپائے جانے کے بعد اپنے کو کھرا نہ ثابت کردے۔ حتی کہ حالات اگر بظاہر بالکل سازگار اور بے خطر دکھائی دیتے ہوں تو بھی قدرت انہیں ناسازگار اور خطرناک بنادیا کرتی ہے، تاکہ ایمانی دعووں کی صداقت جانچی جاسکے۔ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے اس منطق کی داد بھلا کون دے سکتا ہے کہ حالات سخت ناسازگار ہیں اور فضا خطرات سے بھری ہوئی ہے اس لیے دین کی اقامت کا نام لینا صحیح نہیں۔ قرآن حکیم کے نزدیک تو مشکلات اور مصائب کے ذریعے ادعائے ایمان کی آزمائش ضروری ہے۔ لیکن اس کے ماننے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس آزمائش میں کامیاب ہو کر اپنے مومن ہونے کا ثبوت پیش کرنے کے بجائے اسے الٹا اپنے ادائے فرض سے سبکدوش ہو رہنے کی سند جواز بنائے لے رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ فوج کا کوئی سپاہی میدان جنگ کا رخ کرنے سے اس لیے انکار کردے کہ وہاں سے توپوں کے چھوٹنے اور بموں کے پھٹنے کی دہشت ناک آوازیں آرہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھے یہی جارہا ہو کہ مجھے ملک و ملت کا ایک وفادار اور فرض شناس سپاہی کہا جانا اور بہادری کے تمغے کا مستحق تسلیم کیا جانا چاہیے۔ حالانکہ یہ میدان جنگ ہی وہ جگہ ہے جہاں اس اعزاز کا استحقاق حاصل کیا جاسکتا ہے۔

قومی مفاد کا بت:

اس سلسلہ میں قومی مفادات کی دہائی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ کیونکہ اس "دلیل" کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ جس مسلمان کو ہر حال میں انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے اور اللہ کے لیے حق کی بے لاگ شہادت دینے کی تعلیم دی گئی تھی، خواہ اس شہادت میں اسے خود اپنی ہی ذات کے یا اپنے والدین ہی کے یا اپنے اقرباء ہی کے خلاف صف آراء ہونا پڑ جائے (كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ) اور جس کے متعلق یہ طے کیا جا چکا ہے کہ اللہ نے اس کی جان اور مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے (اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى الخ) اب اسی مسلمان کو گویا اس بات کی تلقین کی جارہی ہے کہ اگر انصاف کی راہ چلنے اور حق کی شہادت دینے میں تیری ذات یا تیرے خاندان کا یا تیری قوم کا نقصان ہوتا ہو تو ایسے انصاف کو دیوار پر دے مار، اور ایسی شہادت حق پر لعنت بھیج! اگر اللہ کی رضا جوئی اختیار کرنے سے تیری جان یا تیرے مال پر آنچ آتی ہو تو ایسی خدا طلبی کو دور سے سلام کر۔ غور تو کیجئے قومی مفاد کی محبت میں اپنے مقصد وجود ہی کو چھوڑ بیٹھنے کا خیال کوئی معمولی خیال ہے، یا یہ زندگی کا ایک مستقل بنیادی نظریہ ہے، جس کی اساس پر بننے والی عمارت اس عمارت

سے یکسر مختلف ہوتی ہے جسے اسلام یا قرآن تعمیر کرنا چاہتا ہے؟ اس نظریئے کو اختیار کر لینے والا اگر اپنے کو مسلمان کہتا ہے تو کہے۔ مگر اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایک ایسا "مسلمان" ہے جس کی نگاہ میں بنیادی اہمیت دین اور قیام دین کو نہیں بل کہ اس کے اپنے معاشی اور سیاسی مفاد کو حاصل ہے، جو ایسا کوئی راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتا جس کا تقاضا اسلام چاہے کیسے ہی شد و مد سے کرتا ہو مگر اس کے اختیار کرنے سے اس کو اپنا یا اپنی قوم کا کوئی مادی مفاد خطرے میں پڑتا دکھائی دیتا ہو، اور جو دین کو دنیا پر، آجلہ کو عاجلہ پر، معاد کو معاش پر، رضائے الٰہی کو قومی مفاد پر، یعنی مقصد زندگی کو زندگی پر قربان کر دینے ہی کو دانش مندی سمجھتا ہے۔ کیا اس ذہنیت کو مومنانہ ذہنیت سمجھا جاسکتا ہے۔ کیا یہ وہی انداز فکر ہے جو قرآن اپنے پیروؤں کو سکھاتا ہے؟ اگر یہ ذہنیت اور انداز فکر ایک مومن اور پیروئے قرآن کا ہو سکتا ہے تو پھر وہ کون سی ذہنیت اور انداز فکر ہے جسے ہم کفر اور مادیت کا مخصوص انداز کہہ سکتے ہیں؟ کیا ہمیں قرآن کی یہ بات یاد نہیں رہی کہ "اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے ہیں۔" (مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ) (الاحزاب) اور جب ہر شخص کے سینے میں دل ایک ہی ہے تو اس میں بیک وقت دو محبوبوں اور "معبودوں" کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے۔ اس میں آباد تو صرف ایک ہی کی محبت ہو سکتی ہے۔ یا تو خدا کی یا قوم اور قومی مفاد کی۔ اس لیے حضرت مسیحؑ کی زبان میں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ "کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت، یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے"

(متی: باب ٦)

غرض اس نظریئے کے ساتھ خداپرستی کا جوڑ کبھی نہیں لگ سکتا۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے، آسمان کے سورج سے زیادہ روشن، اس لیے جس قسم کے مفاد قومی کی دہائی دی جارہی ہے وہ ایک خطرناک بت ہے جسے توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جاسکتا۔

زمانۂ نبوت میں بہت سے منافقوں کے نفاق کی بنیاد بھی اسی مفاد پرستانہ ذہنیت پر تھی۔ ایمانی اخلاص کے مطالبے کے جواب میں وہ کہا کرتے تھے کہ:۔

نَخْشٰىٓ اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ (مائدہ ۵۲)

"ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر کوئی مصیبت آجائے گی۔"

یعنی اگر ہم اخلاص کے ساتھ اور بالکل یکسو ہو کر ملت اسلامی میں علانیہ شامل ہو گئے تو ہم کو مصیبتیں گھیر لیں گی۔ ماحول ہمارا دشمن ہو جائے گا اور اسلام کی وجہ سے ہم سارے جہان کی عداوتوں کا نشانہ بن جائیں گے۔

اسی طرح بہت سے تھڑدلے کفار کا بھی کہنا یہی تھا کہ محمدؐ! ہم تمہاری تعلیمات کی سچائی کا انکار نہیں کرتے، مگر ہماری اس مشکل کا کیا علاج کہ:۔

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (القصص:۵۷)

"اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت الٰہی کے پیرو بن جائیں تو (مادر) وطن (کی گود) سے اُچک لیے جائیں گے۔"

یہ دونوں گروہ اتباع حق کے معاملہ میں جس انداز فکر اور طرز استدلال سے کام لے رہے تھے کیا آج قومی مفاد کی باتیں انہی کی یاد تازہ نہیں کر رہی ہیں؟ قرآن سراپا حق ہے۔ پیغمبرؐ صادق و مصدوق ہے۔ اسلام کی صحیح پیروی ہی فلاح اور خوش بختی کا واحد ذریعہ ہے ــــ لیکن اگر قرآن کے مطالبے، رسولؐ کی ہدایات اور اسلام کے تقاضوں پر عمل ہوا تو ہم برباد ہو جائیں گے! ہمیں اندیشہ نہیں بل کہ یقین ہے کہ زمانہ بھر کی آفتیں ہم پر ٹوٹ پڑیں گی۔ ذرہ ذرہ ہماری مخالفت پر کمر باندھ لے گا۔ ہم معاشی غلام اور سیاسی اچھوت بن جائیں گے!!! افسوس! ذرا نہ سوچا گیا کہ یہ قومی مفاد کا بچانا ہے یا اللہ کے غضب کو دعوت دینا؟

صحیح مفادات کے تحفظ کی قطعی ضمانت:۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا، یہ فرض کر کے عرض کیا گیا کہ قومی مفادات کی تباہی کا اندیشہ ایک واقعی اندیشہ ہے۔ لیکن کیا حقیقت بھی اس مفروضے کے مطابق ہی ہے؟ کیا امت اگر دین کی ہو رہی تو دنیا سے فی الواقع اسے ہاتھ دھو ہی لینا پڑے گا؟ قرآن مجید کا کہنا ہے کہ نہیں۔ ایسا ہر گز نہیں ہے' بل کہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی اقامتِ دین کا فریضہ اگر بجالایا گیا تو اس سے صرف آخرت ہی نہیں سنورے گی بل کہ اس کی دنیا بھی اجالی ہو جائے گی' اور کسی ایسی چیز سے وہ محروم نہ رہ جائے گی جس کی عالی حوصلہ قومیں طلب گار اور آرزو مند ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ ان محبوب و مطلوب چیزوں میں سے ایک ایک چیز کا نام لے کر "باایمان" مومنوں کو اس

کے لازمی حصول کی بشارت دیتا ہے۔ مثلاً باعزت امن واطمینان کی زندگی کے بارے میں جو صحیح قومی مفادات میں سے ایک اہم مفاد ہے' وہ فرماتا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ (الانعام:۸۲)

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا' ان کے لیے امن ہے۔"

اسی طرح معاشی خوش حالی کے متعلق وہ اللہ جل شانہٗ کے یہ ارشادات سناتا ہے کہ:۔

وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف:۹۶)

"اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ چلے ہوتے تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔"

وَلَوْ اَنَّھُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰاۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ مِّنْ رَّبِّھِمْ لَاَ کَلُوْا مِنْ فَوْقِھِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِھِمْ (المائدۃ:۶۶)

"اگر یہ اہلِ کتاب توراۃ اور انجیل کو اور ان ہدایتوں کو جو ان کے رب کی طرف سے ان پر اتاری گئی تھیں قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی رزق پاتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔"

سیاسی سربلندی کے بارے میں، جسے غالباً قومی مفادات میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حاصل ہے' وہ اللہ رب العزت کی طرف سے یہ قول دیتا ہے کہ:۔

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء:۱۰۵)

"بے شک زمین کی وراثت میرے صالح بندوں کو ملتی ہے۔"

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (آل عمران:۱۳۹)

"تم ہی غالب ہو گے۔ اگر ایمان والے ہوئے۔"

ان الگ الگ یقین دہانیوں کے علاوہ اس کی ایک جامع یقین دہانی بھی سنئے:۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا۔ (النور:۵۵)

"اللہ تعالیٰ کا تم میں سے ان لوگوں سے، جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل کئے، یہ وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے گا، جیسا کہ تم سے پہلے کے لوگوں کے معاملے میں وہ ایسا کرتا رہا ہے، اور ان کے لیے ان کے اس دین کی جڑیں گہری جما دیگا جسے ان کے لیے اس نے پسند فرمایا ہے اور ان کے خوف کو امن وسلامتی سے بدل دے گا۔"

پھر اسی بات کو منفی شکل میں بھی دیکھئے:۔

لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (المائدۃ:۱۰۵)

"بھٹکے ہوئے لوگ تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے جب تم سیدھی راہ پر ہو گے:۔

قرآن مجید کے یہ سارے وعدے اور اس کی یہ یقین دہانیاں آپ کے سامنے ہیں۔ ان کی روشنی میں اس خوفِ بربادی کی حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے جو اقامتِ دین کا نام سنتے ہی قومی مفاد کے نام نہاد پاسبانوں پر طاری ہو جایا کرتا ہے۔ کیا اب بھی اس ایمان کُش خام خیالی کو کوئی وزن دیا جا سکتا ہے کہ جد و جہد مسلم مفادات کو نگل جائے گی؟ یا اس کے برعکس یہ باور کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اگر ایمان و عملِ صالح کی جرأت مندانہ زندگی اختیار کر کے صحیح معنوں میں یہ فریضہ انجام دیا گیا تو اس کے نتیجے میں ہمیں ہر وہ چیز مل جائے گی، اور قطعاً مل جائے گی جسے قوم و ملت کا واقعی مفاد کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر کسی بدنصیب کو خود ایمان کی قوتِ تسخیر ہی سے بدگمانی ہو اور اللہ کے وعدوں پر اسے اعتماد ہی نہ ہو تو بڑی زبردستی کرتا ہے اگر اس کے باوجود بھی وہ امت مسلمہ کے معاملے میں کچھ بولنے کا اپنے کو حقدار سمجھتا ہے۔ بلاشبہ ایسے لوگوں کو کوئی بڑی سے بڑی دلیل بھی خوف اور مایوسی کی دلدل سے نہیں نکال سکتی۔ ان کے نزدیک تو اقامتِ دین کی جد و جہد کیا، نفسِ اسلام ہی خوف اور تباہی کا سامان ہے۔

ہاں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جد و جہد کے نتیجے میں عزت و اقبال اور امن و خوش حالی کا حصول بڑی دشواریوں اور قربانیوں کے بعد ہی ہو گا۔ اور ابتداء میں ملت کو کچھ نہ کچھ کھونا ضرور پڑے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ دشواری کچھ اسی مقصد کی راہ میں نہیں آتی۔ بل کہ یہاں ہر بڑے مقصد کی خاطر اسی طرح کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، اور جسے کچھ پانا ہوتا ہے وہ پہلے کچھ نہ کچھ کھو ضرور لیتا ہے۔ ایک کسان فصل اٹھانے کے زمانے میں اپنے کھتے اسی وقت بھر سکتا ہے

جب کہ تخم ریزی کے زمانے میں اس نے اسے بقدر ضرورت خالی بھی کیا ہو۔ اس لیے قومی مفادات کی اگر فصل کاٹنی ہو تو اس کے لیے پہلے تخم ریزی کا صرفہ اور دیگر ضروری مشقتیں برداشت کرنی ہی پڑیں گی۔ اور اس حد تک مفادات سے دست برداری کا اندیشہ ہی نہیں بل کہ یقین بالکل بجا ہے۔ لیکن کیا چند پیسے دے کر اشرفیوں کا توڑا حاصل کر لینا کوئی گھاٹے کا سودا ہے؟ اور کیا اسے مفادات کی تباہی کہا جائے گا، یا ان کے بہتر سے بہتر حصول اور تحفظ کی بہتر سے بہتر ضمانت؟

پھیر کا راستہ:

اب رہا یہ سوال کہ آیا ناساز گار حالات کے پیش نظر ہم اس نصب العین کے لیے براہِ راست جدو جہد کرنے کے بجائے کوئی پھیر کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟ تو اس سوال کا جواب کسی طرح بھی اثبات میں نہیں دیا جاسکتا۔ نہ تو عقل[1] اس کی حمایت کرتی ہے نہ حق کی فطرت[2] اسے گوارا کرنے کو تیار ہے، اور نہ اب تک کی تاریخ سے اس بات کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اس مقصد کو صحیح معنوں میں اپنا مقصد زندگی قرار دینے والے کسی شخص یا گروہ نے یہ پالیسی اختیار کی تھی۔ یہ جدو جہد متمدن اور غیر متمدن، آزاد اور غلام، دولت مند اور غریب غرض ہر طرح کی قوموں کے اندر چلتی رہی ہے۔ اور ہر طرح کے حالات میں انبیاء آتے رہے ہیں۔ مگر ہر ایک نے آتے ہی سب سے پہلی آواز جو منہ سے نکالی وہ یہی اور صرف یہی تھی کہ:۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوْا الطَّاغُوْتَ (النحل:۳۶)

"(اے بندگانِ خدا) خدا کی بندگی کرو اور طاغوت سے دور ہو۔"

کاوش کے باوجود بھی کسی نبی کو اس راست پالیسی سے ہٹ کر کوئی پھیر والی پالیسی اختیار کرتے ہوئے نہیں پایا جاسکتا۔ ابھی اس سوال کو چھوڑ دیجیے کہ ان حضراتؑ نے ایسا کیوں کیا؟ پہلے اس حقیقت کو اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لیجیے کہ ایسا ہی ہوا یا نہیں؟ اگر ایسا ہی ہوا، جیسا کہ واقعہ ہے، تو پھر ان لوگوں کے لیے جو اُسوۂ انبیاء ہی کو اپنا مرجع کامل مانتے ہوں، اس طریق کار کو چھوڑ بیٹھنا جائز کس حجت شرعی کی بناء پر ہو سکتا ہے؟ اگر حالاتِ زمانہ کے اختلافات کوئی چیز ہیں تو کیا اس بات کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تمام انبیاء کے زمانے تو بالکل یکساں نوعیت کے تھے جس کی وجہ سے ان سب کے طرز عمل میں ایسی مکمل یکسانی اور ہم رنگی پائی جاتی ہے، اور یہی بیسوی صدی کا زمانہ ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی زمانہ ہے جس کے حالات یکایک اب تک کی پوری انسانی تاریخ کے حالات سے یکسر مختلف ہو گئے ہیں؟

یقیناً کوئی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان اس طرح کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ کچھ بنیادی حقائق تو ایسے ہیں جو کبھی بدلتے ہی نہیں، اور جو تمام زمانوں میں یکساں طور سے کار فرما رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ یہ صرف ظاہری حالات اور عارضی کیفیات ہوتی ہیں جو ہر دور کی الگ الگ ہوتی ہیں، اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ اس لیے ان ظاہری باتوں کا لحاظ کیا جائے تو جس طرح آج کا زمانہ پہلی صدی ہجری سے مختلف ہے اسی طرح پہلی ہجری کا زمانہ دورِ عیسوی سے، اور دور عیسوی دور موسوی سے بھی لازماً مختلف تھا۔ اب اگر اس اختلافِ احوال کے باوجود تمام انبیاء نے یکساں طور پر ہمیشہ براہِ راست جدوجہد ہی کی پالیسی اختیار کی تو اس ظاہری اختلاف کے باوجود بھی جو ہمارے زمانے اور پچھلے زمانوں میں نظر آتا ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم بھی یہی پالیسی اختیار کریں۔ کیونکہ اس کام کے لیے کوئی دوسرا طریقہ کبھی اپنایا ہی نہیں گیا۔ اور تمام انبیاء کا ایک طریق کار کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس جدوجہد کا مزاج ہی براہِ راست اقدام کا طالب ہے۔ یہ دلیل یقین سے بڑھ کر ہم کو حق الیقین کی حد تک پہونچا دے سکتی ہے۔ اگر اس میں تاریخ انبیاء کی یہ گواہی بھی شامل کر دی جائے کہ بعض انبیاء کو پھیر کی پالیسی اختیار کرنے کے بہتر سے بہتر مواقع ہاتھ آئے مگر انہوں نے پوری صفائی اور طمانیت کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قریش کی جس پیش کش کا تذکرہ پچھلے صفحوں میں آچکا ہے، غور فرمایئے اس نے اس پالیسی کا کیسا سنہری موقع فراہم کر دیا تھا؟ جب انہوں نے کہا کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں اور اس کے لیے ہم آپ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ آپ اپنی "دعوتِ توحید" سے دست کش ہو جائیں۔ آپ سے ہماری صرف اتنی گذارش ہے کہ آپ ہمارے بتوں کی تردید اور تحقیر کرنے اور ہمارے دین کی عیب چینیاں فرمانے سے باز رہیں۔— تو آج کے اہل سیاست و تدبر کے نقطۂ نظر سے یہ پیش کش یقیناً ایک نعمت غیر مترقبہ ہی تھی، اور اس کو ٹھکرا دینے کی بابت کچھ سوچنا بھی حرام مطلق سے کم نہ تھا۔ انہیں اگر مشورہ دینے کا موقع ملتا تو ان کا مشورہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہو تا کہ آپؐ اس پیش کش کو فوراً قبول فرمالیں، تاکہ اس سے ایک طرف تو ان مصیبتوں اور فتنوں کا بھی خاتمہ ہو جائے جو آپؐ اور آپؐ کے پیروؤں کی زندگی اجیرن کئے ہوئے ہیں، دوسری طرف تختِ حجاز پر قابض ہو چکنے کے بعد آپ اپنے حاکمانہ اثر و اقتدار سے کام لیتے ہوئے "حکمت کے" ساتھ اپنے دین کی جڑیں بھی مضبوط

کرتے جائیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ پورے عرب پر قائم ہو جائے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبر عالمؐ نے اس "سنہری" موقع پر کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ اور اس پیش کش کا کیا جواب دیا؟ یہ کہ:۔

ما جئت بما جئتكم به اطلب اموالكم ولا الشرف ولا الملك عليكم فبلغتكم رسالات ربي و نصحت لكم فان تقبلوا مني ما جئتكم به فهو حظكم في الدنيا والاخرة وان تردوه عليَّ اصبر لامر الله حتىٰ يحكم الله بيني و بينكم (ابن هشام: جلد اول)

"میں تمہارے پاس جو پیغام لے کر آیا ہوں اس سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ تمہاری دولت حاصل کر لوں، یا جاہ و عظمت کا مالک بن جاؤں۔ یا تمہارا بادشاہ ہو جاؤں۔ سو میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغام پہونچا دیے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر تم میری دعوت کو مان لیتے ہو تو وہ تمہارے لیے دنیا و آخرت دونوں میں باعثِ خیر ثابت ہو گی۔ اور اگر اسے رد کر دیتے ہو تو میں پوری مضبوطی سے اپنے کام میں لگا رہوں گا، یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے۔"

یہ کسی جوشیلے اور جذبات کی رو میں بہنے والے انقلابی نوجوان کے الفاظ نہ تھے بل کہ اس معلم حکمت و دانش کے الفاظ تھے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اس کے دل اور زبان پر خدا کی نگرانی قائم تھی اور جس نے کبھی کوئی بات جذبات سے بے قابو ہو کر نہیں کہی۔ اس لیے ایک مومن تو اس وہم کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دے گا کہ آنحضرت صلی علیہ وسلم نے اس پیشکش کا حق نہیں پہچانا، اور ایک ایسے طریق کار کے ہاتھ آتے ہوئے بھی اسے عمداً ترک کر دیا جو حصولِ مقصد کے لیے راست جد و جہد سے زیادہ موزوں اور کارگر تھا، یا یہ کہ آپؐ میں نعوذ باللہ آج کے نام نہاد مدبروں جیسی بھی انجام بینی نہ تھی کہ ماحول اور زمانے کے تقاضوں کا اندازہ کر سکتے اور اس کے نتیجے میں اس پالیسی کو اختیار کر لیتے۔ ایسا کوئی گمان بھی مسلمان کے لیے ممکن نہیں۔ اب اگر آپؐ نے موقع ملنے کے باوجود دعوتِ حق اور اقامتِ دین کا براہِ راست طریقہ ترک نہیں کیا تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ پھیر کا راستہ اختیار کرنا کسی اور "حکمت و دانش" کے مطابق ہو تو ہو مگر نبویؐ حکمت و دانش کے مطابق ہرگز نہیں ہے۔

خالص عقلی حیثیت سے بھی دیکھئے تو اس طرز فکر اور اس نظریئے میں حیلہ جوئیوں، خوش گمانیوں، اور خود فریبیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھیر کے راستے اختیار کرنے کے معنی یہی تو ہیں کہ ایک زمانے تک حق کو باطل نما بنا کر پیش کیا جائے، اور جس باطل میں مسلمان گھرا ہوا ہے اس سے نکل کر حق کی طرف بھاگنے کے بجائے ایک دوسرے باطل کے سائے میں جا کھڑا ہو۔ کیونکہ اگر وہ موجودہ باطل ماحول کو درہم کر کے ایک ایسا ماحول قائم کرنے کی کوشش کرے گا جو حق نہ ہو تو وہ لازماً باطل ہی ہو گا، جس کا رنگ و روغن تو نیا ضرور ہو گا مگر اصل فطرت اس کی بھی بہر حال وہی ہو گی جو موجودہ باطل کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس پر اثر ڈال کر اپنے نصب العین کے لیے نسبتاً زیادہ سازگار بنالیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ دنیائے عمل میں اس خام خیالی کی کوئی قیمت نہیں۔ کیونکہ باطل خواہ کوئی قالب اختیار کرے وہ حق کے لیے کبھی سازگار نہیں ہو سکتا، اور اگر اس میں حق کے کچھ پیوند آپ بہ ہزار دقّت لگا بھی لیں گے تو بھی وہ آپ کے اصل مقصد کے لیے خالص باطل سے کم مضر ثابت نہ ہو گا۔ دور نہ جائیے، اسی ہندوستان میں بہت سی "اسلامی ریاستیں" قائم ہیں۔ جن میں کم و بیش وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کا آپ آئندہ نظامِ ملکی میں جوڑ لگانا چاہتے ہیں۔ مگر وہاں اقامتِ دین کا نام ہی لے کر دیکھئے۔ زندگی عذاب بنے بغیر نہ رہ سکے گی۔ آپ اپنی اس جدوجہد میں غیر ملکی حکومت ہی کو سدراہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہے ہیں، مگر آپ شاید بھولتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے مشن کے متعلق رومی اقتدار ابھی خاموش ہی تھا کہ ان کو اپنی ہی قوم، یا یوں کہئے کہ اس وقت کے "مسلمانوں" ہی نے بڑھ کر اس کی مشکیں کس دیں۔ پھر اپنی حال کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی دینی دعوت کا متعلقہ "اسلامی" حکومتوں نے کس "تپاک" سے استقبال کیا؟ شیخ جمال الدین افغانی نے ایک ایسی تحریک اٹھائی جو صرف فی الجملہ دینی تحریک تھی۔ مگر آپ کی انہی موجودہ "اسلامی" حکومتوں نے ان کو رہنے کے لیے جگہ دینے تک سے انکار کر دیا۔ اور اگر آج بھی کسی کو ہمت ہو تو ان ممالک میں یہ آواز اٹھا کر قدرِ عافیت معلوم کر سکتا ہے[1]۔

---

[1] یہ الفاظ اس وقت لکھے گئے تھے جب لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر قائم کی جانے والی "مملکت خداداد پاکستان" ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ وجود میں آچکنے کے بعد اس کے ناخداؤں نے وہاں کی اسلامی تحریک کے ساتھ جو کچھ کیا اور پھر چاہنے کے باوجود جو کچھ وہ کر نہ سکے وہ سب کے سامنے ہے۔ اسی طرح مصر کی فوجی حکومت نے وہاں کے اسلام پسندوں کے ساتھ جس بربریت کا سلوک کیا وہ اس تلخ حقیقت کی سب سے زیادہ نمایاں اور عبرتناک مثال ہے۔

درحقیقت یہ دفع الوقتی کی باتیں ہیں، اور یہ نظریہ اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے دعوتِ قرآنی کے جواب میں حالات کی ناسازگاریوں سے گھبرا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا تھا۔ اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ یعنی اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے، یا پھر اسی میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دیجیے جن کے بعد وہ ہماری خواہشوں کے مطابق اور زمانہ و ماحول سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس طرز پر سوچنے والوں کی نگاہ شاید اس طرف نہیں جاتی کہ دنیا کے ہنگامے جیسے آج ہیں کل بھی ویسے ہی رہیں گے اور جو مصالح اور مشکلات آج ان کا راستہ روک رہی ہیں آئندہ بھی ان میں کوئی کمی رونما نہ ہو گی۔ اس لیے اس پالیسی کا حاصل صرف یہ ہو گا کہ نہ کبھی پھیر کے راستے اختیار کرنے کے اسباب و محرکات ختم ہوں گے، نہ اقامتِ دین کے لیے براہِ راست جدوجہد کی کبھی نوبت آسکے گی۔[۲]

---

۲ جس وقت یہ الفاظ لکھے گئے تھے اس وقت تک یہ بات بھی محض ایک قیاس کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن تقسیم ہند کے بعد سے لے کر اب تک کی تاریخ اسے بھی ایک حقیقتِ واقعی ثابت کر چکی ہے۔ آزادی سے پہلے ہمارے جہاندیدہ اربابِ دین و سیاست بڑی بزرگانہ شان سے فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت یہاں انگریز اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ پہلے اسے اکھاڑ دو۔ پھر آزادی کی فضا میں اس کام کو یکسو ہو کر کیا جائے گا۔ مگر آج آزادی کی کھلی فضا میں بھی یہ مبارک زبانیں اس طرح بند ہیں کہ حال تو حال مستقبل بعید کے بارے میں بھی کوئی کلمۂ تشفی سنانے کی جرأت نہیں ہو رہی ہے۔

(۳) کلّی اور ابدی مایوسی

حیرت انگیز حیاکشی:

تیسرا گروہ جو کچھ کہتا ہے، اس کے سوچنے کا جو انداز ہے اور اس کے جو دلائل ہیں وہ سب قریب قریب وہی ہیں جو دوسرے گروہ کی زبانی گذشتہ بحث میں آپ سن چکے ہیں۔ اس لیے انہیں دوبارہ نقل کرنے اور ان کی غلطی واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک حیثیت سے یہ لوگ ان سے مختلف ضرور ہیں، اور وہ یہ کہ فرض ناشناسی اور مقصد فراموشی کی جو بیماری وہاں سیاسی دور اندیشی اور زمانے کی مصلحتوں کے پردے میں چھپا دی گئی تھی یہاں وہ صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ ظاہر کر دی گئی ہے۔ اس لیے ان لوگوں کے ظاہر و باطن کی ہم رنگی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس ایمانی بے غیرتی کا تصور، جو اس صاف گوئی اور جرأت اظہار کے پیچھے کام کر رہی ہے، دل پر بڑی سخت چوٹ لگاتا ہے، اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان لوگوں نے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر پھینک دیئے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنوں نے یہ حیاکشی ہوش اور بیداری کے عالم میں کی ہے۔ اور کتنوں نے غفلت اور بیہوشی کی حالت میں؟ ایک طرف تو اقامتِ دین کی اس اہمیت کو دیکھئے کہ اس کے بغیر مسلمان کا کوئی موقف ہی باقی نہیں رہ جاتا، دوسری طرف ان حضرات کا یہ ارشاد سنئے کہ یہ نصب العین ہے تو بالکل برحق، مگر ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبرؐ کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا ہے، اس ارشاد کا ظاہر یقیناً بڑا عاجزانہ ہے مگر تہہ میں اتر کر دیکھئے تو یہ عاجزانہ نہیں بل کہ باغیانہ نظر آئے گا۔ جب اقامت دین کی جدو جہد

سے از خود کنارہ کش ہو کر اور باطل و منکر کے ساتھ عدم تعرض کی پالیسی اختیار کر کے انسان پیروانِ اسلام کی صفِ پائیں میں بھی جگہ نہیں پا سکتا اور اللہ کے رسول نے ایسے شخص کو ایمان کے آخری ذرّے سے بھی محروم قرار دیا ہے، تو سوچنے کی بات ہے کہ بڑی سے بڑی کمزوری اور مایوسی بھی اس فرض کی انجام دہی سے بے تعلق ہو جانے کا کوئی حق کیسے دلا سکتی ہے؟ اگر کہیں فی الواقع یہ بے تعلقی ہے تو ماننا پڑے گا کہ کسی کمزور سے کمزور ایمان کی تلاش بھی وہاں بے سود ہے۔ اسلام نے اپنا کوئی ایسا "سستا ایڈیشن" شائع نہیں کیا ہے جس کے تحت اس دم خم دکھانے سے نجات ممکن ہو۔ وہ شخص دھوکے میں ہے جو یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اس قطعی لازمہ ایمانی سے بے بہرہ رہ کر بھی ایمان اور رضائے الٰہی کی کوئی مقدار حاصل کی جا سکتی ہے۔[1]

تاریخ خلافت کا "استدلال":

اس طرزِ فکر کی بنیادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت جس چیز کو حاصل ہے اور جو ایک نئی "دلیل" کی حیثیت بھی رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ جو چیز صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں بھی تیس برس سے زیادہ پوری طرح قائم نہ رہ سکی اس کے لیے اب کوئی سعی بالکل لاحاصل ہے۔ یہ "دلیل" ان معنوں میں یقیناً ایک زبردست دلیل ہے کہ اس کا عام لوگوں کے حوصلوں پر بڑا مرعوب کن اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ واقعات شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر مایوسی اور دل شکستگی کا زہر پیدا کرنے میں اس خیال نے جتنا مؤثر پارٹ ادا کیا ہے اس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ لیکن یہ بات کہ یہ "دلیل" واقعۃً بھی دلیل ہے اور وہ عام جذبات ہی کو متاثر نہیں کرتی بل کہ عقل سے بھی اپنا وزن تسلیم کرا سکتی ہے، حقیقت سے بالکل دور ہے۔ کیونکہ اس استدلال میں جس چیز کو بنیاد قرار دے کر اقامتِ دین کے فریضے کو اپنے حق میں ساقط سمجھ لیا گیا ہے اس کا اس فریضے کی ادائیگی سے فی الواقع کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ کسی اصول اور نصب العین پر جب آپ ایمان لا چکے تو اس کے مطالبات آپ کو بہر حال پورے کرنے پڑیں گے، اور اس بات کا آپ کی ذمہ داری پر ہرگز کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کہ اسے کبھی ایک لمبے عرصے تک نافذ العمل نہیں رکھا جا سکتا ہے، اور اگر اس بنیاد پر کسی نے اپنی ذمہ داری کو ادا کرنا چھوڑ دیا تو یہ اس کے قول و عمل کے تضاد کی ایک بدترین مثال ہو گی۔ سوچنا چاہیے کہ ہم نے اسلام کی علمبرداری آیا اس لیے قبول کر رکھی ہے کہ وہ فی نفسہ

---

[1] اس موقع پر "کامیابی کا اسلامی تصور" اور "مومن کی اصل ذمہ داری" وغیرہ بحثوں کو جو پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں، ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہاں اس اجمالی گفتگو سے غلط فہمی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔

حق ہے، یا اسکا کوئی اور سبب ہے؟ اگر کوئی اور سبب ہے تو پھر ہم پر دینی اور اخروی جہت سے اسکا کوئی مطالبہ واجب ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ ہم پر اس کے لیے کسی جدوجہد کے ترک کر بیٹھنے کا الزام لگ سکتا ہے۔ لیکن اگر پہلی بات ہے، جیسا کہ ایک مسلمان کے بارے میں توقع کی جانی چاہیے تو ایک غیر مسلم بھی تاریخ خلافت کی آڑ لینے میں ہمیں حق بجانب نہیں قرار دے سکتا۔ تیس اور چالیس برس تو در کنار، اگر یہ نظام اپنی اصل اور..... معیاری شکل میں کامیابی کے ساتھ کبھی ایک دن بھی قائم نہ رہ سکا ہوتا تو بھی اس کے قائم کرنے کی ہماری ذمہ داری اپنی جگہ جوں کی توں باقی ہی رہتی، اور اس کے لیے سر دھڑ کی بازی بہر حال لگانی ہی پڑتی۔ جب ہم نے اس کو حق مانا اور اس کی علمبرداری کا دعویٰ کیا ہے تو ہمارے یہ دیکھنے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ اس راہ میں کس نے کیا کیا؟ اور کب کیا کیا گیا؟ اب ہمارے فرائض کی تعیین وہ نصب العین کرے گا جس کو حق سمجھ کر ہم نے قبول کر رکھا ہے، تاریخ نہیں کرے گی۔

غالباً اس نام نہاد دلیل کے قریب ترین منطقی نتائج پر بھی غور نہیں کیا گیا، ورنہ اتنی غلط بات منھ سے نہ نکالی جاتی۔ اگر اقامتِ دین کی جدوجہد کے بارے میں اس طرح کے صغریٰ کبریٰ سے کام لینا صحیح ہے تو آیئے یہ بھی دیکھ لیجئے کہ یہ منطق ہمیں کہاں پہونچادیتی ہے؟ آپ نے پڑھا ہوگا کہ کتاب وسنت میں ایک مثالی مومن کی فلاں فلاں صفات بیان ہوئی ہیں اور یہ کہ اللہ ورسولؐ نے معیاری ایمان واسلام کا بڑا اونچا تصور پیش کیا ہے، اتنا اونچا تصور کہ اس پر پورے اترنے والے انسان حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت صہیب رومیؓ، حضرت بلال حبشیؓ، اور انہی کی طرح کے چند سو یا چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں پیدا ہو سکے، اور اس وقت تو اس معیار کا مسلمان شاید ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے، تو اب ذرا اسی منطق سے، جس نے خلافتِ راشدہ کے مثالی اور معیاری دور کا حوالہ دے کر ہم کو اقامتِ دین کی جدوجہد سے دور ہی رہنے کی "ہدایت" کی ہے، معیاری مسلمان بننے کی خواہش اور کوشش بل کہ مطلقاً مسلمان ہی باقی رہنے کی بابت بھی فتویٰ پوچھئے۔ اسے یقیناً فتویٰ یہی دینا پڑے گا کہ اب ایسے معیاری ایمان کا ذکر اور خیال چھوڑ دینا چاہیے اور ان مطلوبہ مثالی صفات کے لیے کوشش بند کر دینا چاہیے۔ حتیٰ کہ مسلمان باقی رہنے کی خواہش بھی غلط ہوگی۔ کیونکہ یہ سب کچھ تم جیسے کمزور انسانوں کے بس کا کام ہی نہیں ہے! ظاہر ہے کہ اگر آپ پہلے استدلال کو غلط نہیں سمجھتے تو اس دوسرے استدلال کو بھی رد نہیں کر سکتے۔ اگر خلافت راشدہ کی قلیل العمری

اجتماعی اور سیاسی پہلو سے ہمیں اس امر کا حق دلا سکتی ہے کہ اب قیامت تک کے لیے قیامِ دین کے تصور سے ذہنوں کو خالی کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ تدیّن و تقویٰ کے سلسلے میں بھی اس "استحقاقِ معذرت" کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن عجیب ماجرا ہے کہ اگرچہ اب ایک "ابو بکرؓ" بھی پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ مگر ایک شخص بھی صدیقی اور فاروقی ایمان کے حصول سے مایوس ہو کر اسلام سے علیحدگی پر، یا معیاری ایمان کی خواہش اور کوشش سے دست برداری پر تیار نہیں۔ اس کے بخلاف ہو یہ رہا ہے کہ خود کو بھی اوپر اٹھانے کی کوششیں جاری ہیں اور دوسروں کو بھی اچھا مسلمان بنانے کے لیے تبلیغی انجمنیں قائم کی جاتی ہیں۔ اشاعتِ دین کے ادارے کھولے جاتے ہیں۔ تعلیم کتاب و سنت کے لیے درس گاہیں جاری کی جاتی ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ صدیقؓ اور فاروقؓ کی سی اسلامیت کے حصول سے مایوس ہونے کے باعث اسلام کا نام لینا چھوڑ دیا جاتا؟ اس کے جواب میں آخر یہی تو کہا جائے گا نا کہ ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ اسلام کے اعلیٰ اور مثالی نمونے تھے۔ ان کے جیسا ایمان و تقویٰ اگر ہم اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے اسلام ہی چھوڑ دیں۔ بل کہ ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کریں اور جہاں تک ہو سکے اسی طرح کا تدیّن پیدا کرنے کی فکر میں برابر لگے رہیں۔ تاریخ نے ہمارے سامنے اسلام کے یہ اعلیٰ ترین نمونے رکھ دیے ہیں۔ تاکہ وہ ہمارے لیے معیار اور مثال کا کام دیں، اور ہم میں سے جسے جتنی توفیق ملے اپنے آپ کو ان کا ہم رنگ بنانے کی کوششیں کرتا رہے اور جس مقام پر وہ تھے اس کی طرف جتنے قدم بڑھا سکتا ہے بڑھاتا رہے۔ سوال یہ ہے کہ یہی بات اقامتِ دین کے سلسلے میں بھی کیوں نہیں سوچی اور کہی جاتی؟ اس اصولی بات کو ایمان و عمل کے ایک محدود دائرے ہی تک کیوں محدود کر لیا جاتا ہے؟ اس کے اطلاق کو کیوں نہیں وسیع تر مسائل تک پھیلنے دیا جاتا؟ یقیناً اس تحدید کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسی اصولی نقطہ نگاہ سے آپ خلافتِ راشدہ سے تعلق رکھنے والی اس بحث کو بھی دیکھیں۔ حضرات ابو بکر و عمر اور عثمان و علی رضوان اللہ علیہم کی انفرادی زندگیوں کی طرح ان کا طرز خلافت بھی ایک معیاری اور مثالی طرز تھا۔ اس طرز کو اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت نے تاریخ کے سینے میں پوری طرح محفوظ کر دیا ہے، تاکہ دینِ حق کے علمبرداروں کے لیے وہ ہمیشہ ایک اعلیٰ معیار اور مثالی نمونے کا کام دیتا رہے، اور جس حد تک ان کے دست و بازو میں خدا نے توانائی بخشی ہو اس نمونے کے اتباع میں برابر کوشاں رہیں، اور اس

وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں جب تک کہ ان کا قائم کیا ہو انظام اس نمونے کا عکس نہ بن جائے، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ان پاکانِ خاص کا ایمان و تقویٰ انفرادی زندگیوں میں ہمارے لیے ایک ایسا معیاری نمونہ ہی جسے سامنے رکھ کر ہمیں اپنے ایمان و تقویٰ کو مسلسل فروغ دینے کی پوری پوری کوشش کرنا ضروری ہے۔ اس سعی و کوشش میں جس حد تک کامیابی ہو جاتی ہے۔ اسی حد تک ہم مکلف اور مسئول بھی ہیں، اور اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں جس حد تک بھی ہم قائم کر سکتے ہیں اسے دین اللہ کا قیام ہی کہا جائے گا۔ جس طرح ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ بن جانا ہم پر فرض نہیں، بل کہ ان کامل نمونوں کو سامنے رکھ کر حتی الامکان ان سے بیش از بیش مماثلت پیدا کرنا ہی ہمارا فریضہ ہے، اسی طرح ہر حال میں انہی جیسی معیاری خلافت کا قائم کر دینا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ ہماری اصل ذمہ داری صرف یہ ہے کہ... جہاں تک ہو سکے ان کی قائم کی ہوئی خلافتوں سے زیادہ سے زیادہ مشابہت رکھنے والا اجتماعی نظام قائم کرنے کی پوری سعی کریں، اور آگے آنے والی نسلیں یکے بعد دیگرے اس مشابہت کے رنگ کو اور زیادہ نکھارتے رہنے کی کوشش کرتی رہیں۔

اس لیے اس تیس سالہ دورِ خلافت کو اپنے لیے مثال اور اسوہ بنائیے اور اس کی بلندیوں سے دہشت کھا کر بھاگ کھڑے ہونے کے بجائے اس سے درسِ عمل لیجئے۔ انسانیت کا یہ دورِ سعادت اقامتِ دین کی جدو جہد پر ابھارنے والی چیز ہے نہ کہ اس سے بد دل کرنے والی۔ حیف ہے اگر اس کے نام سے دلوں میں مایوسی اور افسردگی کی لہریں اٹھیں۔ اس نام میں تو بلا کی کشش، اور اس کشش میں طوفان کا سا جوش بھرا ہوا ہے۔ اگر مسلمان کا یقین ہے کہ انسانیت کی فلاح صرف دینِ حق کے قیام ہی سے وابستہ ہے اور اگر اس کا سینہ اس مبارک زمانے کی سچی قدر و محبت سے خالی نہیں ہو گیا ہے جس میں خدا کی مرضی زمین پر بھی اسی طرح پوری ہو رہی تھی جس طرح کہ آسمان پر پوری ہوتی رہتی ہے، تو اس یقین اور اس قدر و محبت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ دل اس گذری ہوئی خوش گوار حقیقت کو واقعات کی دنیا میں پھر سے کار فرما دیکھنے کے لیے مسلسل بے قرار رہے۔ جس شخص کے ایمان میں یہ بے قرار روح نہ ہو وہ دراصل ایمان ہی نہیں، بل کہ ٹھنڈے تصورات کا ایک بُت کدہ ہے۔

اسلامی نظام کے متعلق ایک شدید غلط فہمی:

اوپر کی سطروں میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے فی نفسہ یہ خیال ہی غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلامی نظام صرف تیس سال قائم رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب خیال کچھ ٹھوس

علمی مواد اور تاریخی حقائق سے پیدا نہیں ہوا ہے بل کہ اسے بالقصد پیدا کیا گیا ہے۔ اس خیال کے پیدا کرنے میں چالاک دشمنوں کی عیاری اور نادان دوستوں کی سادہ لوحی دونوں ہی شامل ہیں۔ امر واقعہ صرف یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد بھی مسلمان پیدا ہوئے اور برابر پیدا ہوتے رہے اسی طرح ان کی خلافتوں کے بعد بھی مدتوں اسلامی نظام قائم رہا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ان حضرات کی شخصیتیں بے داغ تھیں اسی طرح ان کی خلافتیں بھی خیر کامل کا نمونہ تھیں، اور جس طرح بعد میں آنے والی شخصیتیں ناقص تھیں اسی طرح ان کے وقت کا طرز خلافت بھی ناقص تھا۔ شخصیتوں کا ناقص ہونا اگر کسی حال میں بھی ان کے غیر مسلم ہونے کے ہم معنی نہیں تو اس طرزِ خلافت کے ناقص ہونے کے معنی بھی یہ نہیں ہو سکتے کہ یہ خلافتیں غیر دینی اور ان کا زیر عمل نظام غیر اسلامی تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جس طرح مسلم افراد میں اسلامیت کے مدارج مختلف ہوتے ہیں اسی طرح کتاب و سنت کو اصل ماخذ قانون تسلیم کر کے چلائے جانے والے سیاسی نظاموں کے بھی مدارج مختلف ہوتے ہیں۔ جس طرح اشخاص میں کمزوریاں ہوتی ہیں اسی طرح اسٹیٹ میں بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ خود اس تیس سالہ خلافتِ راشدہ کے سب دور بھی اپنی روح میں یکساں نہ تھے۔ بل کہ عثمانی اور علوی خلافتیں صدیقی اور فاروقی خلافتوں سے کم معیاری تھیں، جس پر احادیث اور تاریخ دونوں شاہد ہیں۔ اس لیے جب ہم افراد کی کمزوریوں پر تنقید تو کرتے ہیں مگر ان کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے تو اس تیس سالہ دور خلافت کے بعد قائم رہنے والے سیاسی ڈھانچے پر بھی سخت سے سخت تنقید تو کی جا سکتی ہے اور ان کو جاہلیت کے عناصر سے مخلوط بھی کہا جا سکتا ہے، مگر انتہائی زیادتی ہو گی اگر انہیں بالکلیہ غیر اسلامی اور جاہلی قرار دے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح علمائے حق بد عمل مسلمانوں کی ہدایت و تذکیر کا فرض ادا کرتے آئے ہیں اسی طرح وہ ان ناقص حکمرانوں کی غلط کاریوں پر ضرور ٹوکتے رہے اور ان کے طرزِ حکومت کے نقائص پر اظہار نکیر کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی برابر کوشش کرتے رہے ہیں، مگر اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے ان کے خلاف یہ فتویٰ کبھی صادر نہیں کیا کہ یہ حکومتیں سراسر غیر اسلامی اور کافرانہ ہیں۔ غرض خلافتِ راشدہ کے بعد بھی مدتوں جو سیاسی نظام اسلامی ممالک میں نافذ رہے وہ کم و بیش اسلامی ہی تھے۔ عدالتیں اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرتی تھیں۔ سزائیں احکامِ شریعت کے تحت دی جاتی تھیں، جائدادیں دینی ضوابط کی رو سے تقسیم کی جاتی تھیں۔ مختصر یہ کہ جو کچھ خرابی تھی حکمرانوں کے طرز انتخاب میں اور ان کی

ذات میں تھی، ورنہ جہاں تک زندگی کے عام معاملات کا تعلق ہے اتھارٹی کتاب وسنت ہی کو حاصل تھی۔ اور اس کے گوشے گوشے پر نظامِ دین کی بالادستی بدستور چھائی ہوئی تھی۔ حتی کہ خراب سے خراب حکمراں بھی اپنی کوئی غیر اسلامی کارروائی انجام دینے کے لیے اس بات پر مجبور تھا کہ چہرے پر تشرع کی نقاب ڈال لے، اور اس بات کا وہ تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ خدا کے دین اور قانون کی جگہ اپنا دین اور قانون چلادے۔

غلط فہمی نہ ہو، اس تقریر کا منشا یہ نہیں ہے کہ ان تمام حکومتوں کو خالص اسلامی حکومت قرار دے دیا جائے جو خلافتِ راشدہ کے بعد قائم ہوتی رہی ہیں، اور نہ اقامتِ دین کا فریضہ یاد دلانے کا یہ مقصد ہے کہ معتصم باللہ یا ہارون رشید کی طرح کا کوئی نظام حکومت قائم کرنے کی دعوت دی جارہی ہے اور اُس پر مطمئن ہو جانے کی تلقین کی جارہی ہے، بل کہ اس کا منشا صرف یہ بتانا ہے کہ خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہو جانے کے بعد بھی اللہ کا دین، ایک لمبی مدت تک دنیا میں قائم ونافذ رہا، اگرچہ جس انداز میں وہ قائم ونافذ تھا وہ اپنے مظاہر کے اعتبار سے بھی ناقص تھا اور اپنی روح کے اعتبار سے بھی۔ مگر ان تمام نقائص کے باوجود اس سے بحیثیت ایک اسلامی نظام کے قائم ونافذ رہنے کی نفی ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے یہ پروپیگنڈہ کرنا کہ یہ نظام صرف چند دنوں قائم رہا ایک علمی بددیانتی اور تاریخ سے بہت بڑی فریب کاری ہے۔ اس کا مقصد یا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اسلام اور اسلامی نظام سے لوگوں میں بدگمانی پیدا کردی جائے۔

اسلامی نظام سب سے زیادہ عملی نظام:

جو لوگ خلافتِ راشدہ کی، دوسرے لفظوں میں اسلامی نظام کے معیاری قیام ونفاذ کی قلیل العمری کو اس بات کی دلیل بناتے ہیں کہ یہ نظام اپنی داخلی نوعیت ہی کے اعتبار سے اب ایک ناممکن العمل نظام ہے، انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اسلام کے مقابلے میں وہ کونسا نظام ہے جو اپنے نظریاتی معیار کے مطابق اس سے زیادہ مدت تک قائم اور نافذ رہ سکا ہے؟ اگر وہ بتانا بھی چاہیں گے تو شاہی یا آمریت کا نام تو بہر حال نہ لیں گے۔ کیونکہ یہ دراصل نظام ہی نہیں ہیں۔ اور اگر نظام ہیں بھی تو ایسے نظام ہیں جن کی بنیاد جنگل کے آئین پر ہوتی ہے اور جن کو پوری انسانیت متفقہ طور سے رد کر چکی ہے۔ اس لیے لے دے کر وہ صرف جمہوری اور اشتراکی نظاموں کا نام لے سکتے ہیں۔ جن کا آج پوری دنیا پر سکہ چل رہا ہے اور جن کی مدح ومنقبت میں اپنے اپنے کیمپ سے بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ آج تک ان کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ وہ کبھی تیس

سال نہیں، تیس مہینے، بل کہ تیس دن بھی اپنے معیاری رنگ میں قائم اور نافذ کئے جاسکے ہیں۔اس کے بخلاف تاریخ وسیاست کا پورا لٹریچر اس بات کے اعتراف سے بھرا پڑا ہے کہ جمہوریت ہو یا اشتراکیت کوئی بھی عملاً اپنے نظریاتی معیار تک نہیں پہونچ سکی ہے، اور کتابوں میں درج نظریات واقعات کی دنیا میں اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے۔

جمہوریت کے بارے میں مشہور مفکر برنارڈ شا کہتا ہے کہ:۔

"اس مقصد کے حصول میں ایک ایسی مشکل حائل ہے جو تقریباً ناقابل حل ہے، اور وہ یہ خوش فہمی ہے کہ ہر فرد کو ووٹ دینے کا حق مل جانا جمہوریت کی کامیابی کی ضمانت ہے حالانکہ یہی وہ چیز ہے جس سے جمہوریت کے مقاصد قطعی طور پر فوت ہو جاتے ہیں۔ بالغ رائے دہندگی کا اصول جمہوریت کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ پڑھے لکھے اور اونچی فکر رکھنے والے لوگ جمہوریت چاہتے، لیکن پولنگ اسٹیشنوں پر ان کی حیثیت ایک معمولی اقلیت کی ہوتی ہے"۔

اطالوی مدبر میزینی لکھتا ہے کہ:۔

انسان بادشاہ کی شکل میں ایک ہو یا جمہوریت کی شکل میں زیادہ ہوں بات یکساں ہی رہے گی"

ڈین رنج صاف کہتا ہے کہ:۔

"ایک مکمل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں ہوسکتی جس حد تک نظریۂ جمہوریت اسے جمہوری بتاتا ہے۔"

لارڈ برانس اور جمہوریت کے دوسرے بہت سے حامیوں نے اپنے کو اس اعتراف پر مجبور پایا ہے کہ:۔

"حقیقی جمہوریت کبھی بھی، اور دنیا کے کسی گوشے میں بھی معرضِ وجود میں نہیں آسکی ہے۔"

رہی اشتراکیت، تو اس کا مقدمہ جمہوریت سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ حتی کہ جو نکتہ اس وقت گفتگو کا موضوع ہے اس کی بحث میں وہ کسی ذکر کے قابل ہی نہیں ہے۔ یہ مخالفانہ پروپیگنڈے کی بات نہیں ہے۔ بل کہ ایک تسلیم شدہ اور بدیہی حقیقت کا اظہار ہے۔ چنانچہ اگر وہ غرض و غایت سن لی جائے جو اس اشتراکیت کے پیشِ نظر ہے تو یہ حقیقت سورج کی طرح خود عیاں ہو جائے گی۔ اشتراکیت کے مشہور و مستند امام فریڈرک اینجلز کے بیان کے مطابق اشتراکی نظام کی غایت مقصود یہ ہے!

"ایک ایسے سماج کی تشکیل جس میں نہ مختلف طبقات ہوں گے نہ انفرادی بقا کے

لیے کش مکش ہو گی۔ انسان فطرت کا باشعور آقا ہو گا۔ اپنی تاریخ خود بنائے گا۔
مجلسی اسباب اس کی اپنی مرضی کے مطابق نتائج پیدا کریں گے۔ وہ احتیاج کی دنیا
سے نکل کر اختیار کی دنیا میں داخل ہو چکا ہو گا۔ اور ریاست و حکومت ماضی کی یاد
گاریں بن چکی ہوں گی۔" (سوشلزم)

آج اشتراکیت کو اقتدار حاصل کئے ہوئے تقریباً چالیس سال ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت وہ متعدد ملکوں میں داد حکمرانی دے رہی ہے مگر کیا کہیں بھی یہ نظریاتی سماج دکھائی دے رہا ہے؟ روس اس کا سب سے پہلا گہوارہ اور مضبوط قلعہ ہے، مگر کیا کبھی کسی کی زبان سے یہ دعویٰ سنا گیا ہے کہ وہاں نہ طبقات ہیں نہ احتیاج ہے۔ نہ ریاست ہے نہ حکومت ہے۔ اور ہر شخص اپنی تاریخ خود بنا رہا ہے! ظاہر ہے کہ جب وہاں یہ سب چیزیں موجود نہیں ہیں تو ایسا پہاڑ جیسا جھوٹ کون بول سکتا ہے چنانچہ اشتراکیت کے سارے حامیوں کا کہنا ہے کہ ابھی یہ نظام اپنے عبوری دور سے گذر رہا ہے۔ اور ارتقاء و تغیر کے متعدد مرحلے طے کر چکنے کے بعد اپنے اس نظریاتی معیار تک پہونچے گا۔ یہ بات کہ اشتراکی نظام آئندہ چل کر کبھی اپنے دعوے اور وعدے کے مطابق ایسا سماج پیدا کر بھی سکے گا؟ اس وقت خارج از بحث ہے۔ اس وقت تو دکھانا صرف یہ تھا کہ اشتراکیت ابھی تک ایک دن کے لیے بھی اپنی معیاری شکل میں کہیں قائم اور نافذ نہیں ہو سکی ہے۔ یہ بات واقعات کو بھی تسلیم ہے اور اشتراکیت کے ایک ایک حامی اور علمبردار کو بھی۔

دوسرے نظاموں کے اس جائزے سے صورت واقعہ کیا قرار پائی؟ یہی نا کہ دنیا کے قابل ذکر نظاموں میں سے اگر کوئی نظام اپنے معیاری رنگ میں قائم اور نافذ ہو سکا ہے تو وہ صرف اسلامی نظام ہے۔ اس کے سوا دنیا کسی دوسرے ایسے نظام سے واقف نہیں جو تھوڑی سے تھوڑی مدت کے لیے بھی اپنا مثالی کردار پیش کر سکا ہو۔ اس لیے اگر کسی نظام کا معیاری قیام و نفاذ ہی اس کے قابل قبول ہونے کی دلیل ہے تو یہ دلیل صرف اسلام کے پاس ہے، اور اس کی اس امتیازی حیثیت کو کوئی اور نظام چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کی موجودگی میں یہ بات بھی کتنی عجیب بات ہو گی کہ اسلامی نظام کا قیام چوں کہ بہت تھوڑے دنوں رہ سکا تھا اس لیے اب اسے دوبارہ قائم کرنے کی جدوجہد ایک فضول جدوجہد ہو گی۔

(۴) تربّص کا رویہ

اب ان حضرات کے افکار کا جائزہ لیجئے جو تربص کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور خود سلامتی و بے فکری کے محفوظ گوشوں میں بیٹھے ہوئے دوسروں کی ثابت قدمی اور تیز گامی کا حساب لگا رہے ہیں، اور اسی کام کو اپنی زندگی کا اصل فریضہ کہنے کے باوجود میدانِ عمل میں اس لیے نہیں اترتے کہ پہلے سے اس میدان میں اترے ہوئے لوگوں کی عزیمت انہیں مشکوک نظر آتی ہے۔

نفاق زدہ ذہنیت:۔

اس انداز فکر کی لغویت پر عقل حیران ہے کہ کیا کہے۔ ایک چیز کو تسلیم فرض عین کیا جارہا ہے مگر ساتھ ہی اس سے عملی تعلق کا یہ حال ہے کہ جب تک دوسرے اس کا حق ادا کر کے دکھانہ دیں ہم اس کے لیے اپنی جگہ سے جنبش نہ کریں گے۔ یہ بالکل ایسی بات ہے کہ اگر امام ان لوگوں کے خیال کے مطابق صالح اور متقی اور مقبول الصلوٰۃ نہ ہو تو یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اس کے پیچھے ہی نماز پڑھنے سے انکار کردیں گے بل کہ سرے سے نماز ہی چھوڑ بیٹھیں گے، اور اپنے خیال میں کل، حشر کی عدالت میں یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ خدایا! ہم تو نماز کو فرض عین ہی سمجھتے تھے، اور چوبیس گھنٹے اس کے لیے باوضو رہتے تھے، مگر مؤذن کی اذانوں اور امام کی نمازوں میں ہم کو خلوص وللّٰہیت کی روح نظر نہیں آتی تھی، اس لیے ہم نے نماز نہیں پڑھی! کیا غور و فکر کے باوجود بھی اس طرز فکر اور استدلال کے لیے کوئی شرعی یا عقلی بنیاد فراہم کی جاسکتی ہے؟ فرض کیجئے کہ زید اقامتِ دین کی دعوت دے رہا ہے اور ہماری فرض ناشناسیوں پر جھنجھوڑ کر ہمارا فرض زندگی ہمیں یاد دلا رہا ہے۔ نیز اپنے طور پر اس راہ میں قدم بھی رکھ دیتا ہے لیکن جہاں تک اس کی عملی صلاحیت، خلوص اور عزیمت کا تعلق ہے آپ کو اس پر پورا اطمینان نہیں ہوتا، بل کہ وہ اور اس کے سارے ہم سفر آپ کو نااہل، بے عمل، غیر مخلص اور غیر متقی دکھائی پڑتے ہیں۔۔۔۔ تو سوال یہ ہے کہ ان کی یہ ساری خامیاں آپ کے اپنے فرض کو ساقط، اور آپ کو اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش کس طرح کرادیں گی؟ کیا آپ نے اس امر کو حق اس لیے مانا تھا کہ زید اور اس کے ساتھیوں کی یہی رائے ہے؟ کیا آپ نے دینِ حق کی اقامت کو اپنی زندگی کا اصل فریضہ اس شرط کے ساتھ تسلیم کیا تھا کہ پہلے زید اور اس کے ہمراہی ٹھیک ٹھیک ادائے فرض کا عملی ثبوت دے

لیں، تب ہم اپنے نرم گرم بستروں سے اٹھیں گے اور اپنی آرام گاہوں سے قدم باہر نکالیں گے؟ کیا قرآن کی مرکزی دعوت پر لبیک کہنے کے آپ اسی وقت مکلّف ہیں جب دوسروں کو اس کی راہ میں قربانیاں کرتے دیکھ لیں؟ اگر ایسا نہیں ہے۔۔۔۔اور قرآن گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے تو خود اپنے نفس کی حیلہ سازیاں اور غفلتیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی کمزوریاں ٹٹولنے کی آپ کو فرصت مل جاتی ہے! دوسرے اگر فی الواقع ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو خدا کے روبرو اس کے جوابدہ خود ہوں گے۔ آپ اس کھود کرید کی زحمت، کہ کس کے اندر کیا ہے، بلا وجہ کیوں اٹھائیں؟ ہر شخص کو صرف اپنے نامۂ اعمال کی فکر کرنی چاہیے، دوسروں کی ناقابل اطمینان حالت پر اگر نظر جائے تو صرف درسِ عبرت کے لیے کہ حکمت و دانش کا یہی تقاضا ہے۔ حضرت لقمان سے پوچھا گیا کہ "آپ نے ادب کس سے سیکھا؟" جواب دیا کہ "بے ادبوں سے"۔ مومن کو بھی اللہ تعالیٰ حکیم دیکھنا چاہتا ہے۔ اور ایسی ہی عبرت پذیر اور حکمت پسند نگاہوں سے کام لینے کی اس نے اسے تاکید کی ہے۔ سارا قرآن اس نے مغضوب اور گمراہ قوموں کے تفصیلی تذکروں سے اسی لیے تو بھر رکھا ہے کہ مسلمان ان کی جیسی فکری اور عملی غلط کاریوں سے اچھی طرح باخبر ہو رہیں۔ (وَ وَلِتَسۡتَبِيۡنَ سَبِيۡلُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ) اور ان سے ہمیشہ بچتے رہیں۔ اس لیے اس صورتِ حال کا مطالبہ، کہ اقامتِ دین کا داعی شخص یا گروہ نااہلی کا مظاہرہ کر رہا ہے، ہم سے اگر ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ ان کی خامیوں، ظاہر داریوں، اور غلط کاریوں کو اپنے لیے بے عملی کی سند بنا لینے کے بجائے ان سے خود اپنے دامن کو بچائیں اور پوری للہیت اور عزیمت کے ساتھ اس جھنڈے کو لے کر آگے بڑھیں۔ اس کے سوا اگر کوئی اور صحیح بات ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ان کے لیے ہدایت، عزیمت، خلوص اور توفیق عمل کی دُعا کرتے جائیں، کہ ان کی چیخ پکار اگرچہ ان کی اپنی حد تک "محض زبانی نعرہ اور بے جان دعویٰ" تھی مگر ہمارے آپ کے حق میں تو وہی ہادی اور مذکر ثابت ہوئی۔ اس لیے فی الواقع وہ تو ہمارے اور آپ کے شکریے کے مستحق ہیں۔ نہ کہ کسی طنز یا مخالفت کے۔ اس نادان اور بدنصیب انسان پر، جو تاریکیوں کے ہجوم میں سرِ راہ چراغ لے کر کھڑا ہو اور دوسروں کو تو ان کی منزل مقصود دکھا رہا ہو مگر خود اپنی آنکھوں پر اس نے پٹی باندھ رکھی ہو، آپ کو افسوس تو ضرور آنا چاہیے۔ مگر اس پر بے دردانہ اعتراضات کرتے رہنا بے انصافی ہے، اور اس کی پیروی کرتے ہوئے چراغ کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت اور بدبختی ہے۔ خوش بخت وہ ہے جو دوسروں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے۔

اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ قائل کی شخصیت کے بجائے اس کے قول کو دیکھا جائے۔
پس اقامتِ حق کی پکار سن کر اللہ کے اُن بامراد بندوں کا سا رویہ اختیار کیجیے۔ "جو اللہ کی باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور پھر ان بہترین باتوں کی پیروی میں لگ جاتے ہیں۔" (اَلَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ۔ (الزمر:۱۸) دعوتِ اقامتِ دین" کے بارے میں اس طرح کی کوئی بحث تو ہے نہیں کہ وہ "القول" (اللہ کا قول) ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ مسلمہ طور پر "القول" ہے۔ اس لیے بلا تامل اور بغیر توقف اس پر لبیک کہیے۔ اور اگر ساری دنیا بھی اس کے اپنانے سے جی چرا رہی ہو تو بھی یقین رکھیے کہ اس سے آپ کی اپنی ذمے داریوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی، اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے اخلاص و عزیمت کا انتظار کرتے رہیں۔ یہ انتظار تو حق پرستی کی ضد ہے اور جو شخص حق کو جان پہچان لینے کے بعد بھی انتظار کی پالیسی اختیار کرتا ہے وہ دراصل حق کی قدر ہی نہیں پہچانتا اور اک گونہ اس کی راہ بھی روکتا ہے۔

بہت ضروری ہے کہ اس موقع پر اس رسوائے عالم گروہ کا حال اور انجام یاد کر لیا جائے جس نے رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کی جاں فروشانہ دعوتی سرگرمیوں کے معاملے میں یہی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ اور جس کے لیے اس مہم میں شریک ہو جانے کے سلسلے میں یہ احساس فرض کافی نہ تھا کہ یہ لوگ جس کام کے لیے اپنی جانیں کھپا رہے ہیں اسی کو ہم نے بھی حق تسلیم کر رکھا ہے، بل کہ جو حق و باطل کی اس کش مکش سے دور کھڑے اس کے انجام کا اندازہ لگاتے رہتے تھے، اور مسلمانوں کی جماعت میں صرف اس وقت آ ملتے تھے جب ان کی فتح کے جھنڈے لہراتے دیکھ لیتے۔

اَلَّذِیۡنَ یَتَرَبَّصُوۡنَ بِکُمۡ فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ فَتۡحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوۡۤا اَلَمۡ نَکُنۡ مَّعَکُمۡ

(النساء:۱۴۱)

یہ لوگ تمہارے سلسلہ میں انتظار کرتے رہتے ہیں اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح مل جاتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔

غور فرمائیے کہ جو لوگ اقامتِ دین کو اپنا منصبی فریضہ سمجھتے ہوئے بھی محض دوسروں کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کی خاطر آمادۂ عمل نہیں ہوتے، ان کی ذہنیت کتنی قریبی مشابہت رکھتی ہے اس ذہنیت سے جس پر ان منافقوں کے طرز عمل کی بنیاد تھی؟ جس طرح وہ "منافق" حق کی حمایت حق کی خاطر نہیں کرتے تھے اسی طرح اِن "مسلمانوں" کے نزدیک بھی حق کا مجرد حق ہونا ہی آمادگیٔ عمل کے لیے کافی نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ لوگ

مسلمانوں کی فتح کا انتظار کیا کرتے تھے، اور یہ حضرات اقامتِ دین کے داعیوں کے عزم واخلاص کے بارے میں کسی "شرح صدر" کے منتظر ہیں! لیکن اتباعِ حق اور ادائے فرض سے بھاگنے میں دونوں مشترک ہیں۔

ایک قدم اور آگے:

کاش بات یہیں تک رہتی اور انتظار و تربص کے صرف سلبی پہلو پر ہی اکتفا کر لیا گیا ہوتا۔ مگر یہ دیکھ کر صبر اور ضبط کا دامن سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے کہ لوگ اسی حد پر رک رہنے کے لیے تیار نہیں۔ بل کہ خدا پرستی، اتباعِ قرآنی اور عشق محمدیؐ کی دعویدار امت میں کچھ ایسے افراد بھی موجود ہیں جنھیں انتظار اس بات کا ہے کہ اقامتِ دین کے "جھوٹے مدعی" میدان سے کب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور انھیں اپنے جذباتِ طعن و تشنیع کی تسکین دہی کا موقع کب نصیب ہوتا ہے۔ یہ حضرات ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ فرمایا کرتے ہیں کہ یہ ہوش سے عاری اور جوش کے اندھے لوگوں کا ایک ٹولا ہے جو "قیام دین" "قیامِ دین" کا شور مچا رہا ہے۔ زمانے کے حوادث خود ہی اس کا فاتحہ دیں گے، اور یہ فرما کر گویا اپنی ذمے داریوں کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن شاید انھیں خبر نہیں کہ ان کے اس نشترِ طعن کی زد خود ان کی اپنی رگِ گلو تک جا پہنچتی ہے۔ افسوس! مسلمان کا دل اب قیامِ دین کی حسرتوں سے بھی اس درجہ محروم ہو گیا ہے کہ اگر خود نہیں کچھ کر سکتا تو دوسروں کا کچھ کرنا بھی اس کو گوارا نہیں رہا۔ آخر یہ باور کرنے کے لیے کہاں سے دل و دماغ لائے جائیں کہ جو سینہ دین حق کی محبت اور فدویت کا امین بنایا گیا تھا اب اس میں ان آرزوؤں کی پرورش کی جا رہی ہے جو صرف کفر اور فروغِ کفر کے خلاف مخصوص ہونی چاہیے تھیں۔ حالانکہ اگر کسی کے اندر اتنی غیرت اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ کرنے لیے قدم اٹھا سکے تو اس کے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ تو ہونا ہی چاہیے تھا کہ اس کی تمنا سے اپنے قلب و دماغ کو ایک لمحہ کے لیے بھی خالی نہ ہونے دیتا۔ اور اگر اللہ کے کچھ بندے اس کے لیے قدم اٹھا رہے ہوں تو ان کے لیے اخلاصِ عمل، ثباتِ قدم، نصرتِ حق اور حسنِ انجام کی دعائیں ہی کرتا رہتا۔ لیکن اگر کوئی اتنا بھی نہیں کر سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرتِ حق کی آخری چنگاری بھی اس کے اندر بجھ رہی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ اس دعوتِ حق کو فتنہ قرار دے بیٹھے۔

لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے لگ جائے اور اس کے لیے حوادثِ روزگار کی تمنائیں کرنے لگے، تو اس کی بد بختی کی یہ انتہا ہو گی۔ اور ایسی صورت میں اس کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ کیونکہ اس وقت وہ ذہنیت اور طرزِ اظہار کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ بالکل اسی مقام پر ہو گا جہاں سے کبھی کچھ بد نصیب، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اولو العزم ساتھیوں کے بارے میں ہلاکتوں کی راہ تکا کرتے تھے، جس کا تذکرہ قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَماً وَّیَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ.

(التوبة :۹۸)

اور کچھ دیہاتی ایسے ہیں جو (اللہ کی راہ میں) جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں، اور تم مسلمانوں کے حق میں آفاتِ زمانہ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

یا پھر اس مقام پر، جہاں سے پیغمبر عالمؐ کی دلوں کی جیت لینے والی دعوتِ حق کو یہ کہہ کر ٹالا گیا تھا کہ:۔

شَاعِرٌ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ. (طور: ۳۰)

یہ ایک شاعر ہے، ہم اس کے لیے حوادثِ روزگار کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

لہذا جنہیں اللہ نے عقل دی ہے اور عقل کے ساتھ ایمان کی تھوڑی سی محبت بھی عطا کی ہے، وہ اس خطرناک اور ایمان سوز ذہنیت کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔

(۵) مہدی موعود کا انتظار

آخری گروہ ان لوگوں کا ہے جو امام مہدی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان کے فکر و استدلال کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس سال کے بعد خلافتِ راشدہ کے ختم ہو جانے کی خبر دی تھی۔ چنانچہ وہ اس مدت پر ختم بھی ہو گئی۔ دوسری طرف حضورؐ یہ بشارت بھی سنا گئے ہیں کہ جب دنیا اپنی زندگی کے دن پورے کر چکنے کو ہو گی تو ایک مرد صالح (الامام المہدی) کا ظہور ہو گا، جن کے ہاتھوں اللہ کی زمین پر خلافت علی منہاج النبوۃ کا قیام عمل میں آئے

گا۔ اس نقطۂ آغاز کا نقطۂ انجام یہ ہے کہ "اس نصب العین کے برحق ہونے کے باوجود اب ہم اس کے لیے کسی جدوجہد کے مکلّف ہی نہیں ہیں۔"

استدلال یا فریب استدلال:۔

دین اور اس کی اصول و مقاصد سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ اب اس قسم کی باتوں کو بھی دلیل سمجھا جاتا ہے، اور دلیل بھی اتنی زبردست جو مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اور رویہ ہی بدل دے سکتی ہے اور جس نے افیون کی گولی بن کر کتنے ہی عوام اور خواص کو اپنے فریضۂ زندگی کی طرف سے غافل اور بے حس بنا رکھا ہے اس لیے یہ واضح کر دینے کی بہرحال ضرورت ہے کہ یہ دلیل نہیں ہے بل کہ نفس کا یا پھر نگاہ کا ایک فریب ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ظہور مہدی کی خبر ہمیں ملی کہاں سے ہے؟ اور دینی حقائق کی فہرست میں اس کا مقام کیا ہے؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے قدرتاً ہماری نگاہ سب سے پہلے قرآن پر جاتی ہے، مگر اس کے صفحات کو ہم اس کے ذکر سے بالکل خالی پاتے ہیں حالانکہ دین کی اصولی تعلیمات میں اس مسئلے کو اگر کوئی ایسی اہمیت حاصل ہوتی جو ہماری زندگی کے بنیادی فریضے پر ایک فیصلہ کن انداز میں اثر ڈال سکتی ہو، تو عقل عام کہتی ہے کہ قرآن اس کے متعلق ہم کو لازماً واضح ہدایتیں دیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اس مسئلے کو دین اور دینی افکار و تصورات میں کوئی بنیادی اہمیت حاصل ہے ہی نہیں۔ اور جب صورتِ واقعہ یہ ہے تو اُمتِ مسلمہ کے مقصد وجود جیسے اہم ترین معاملے کے متعلق اسے کوئی فیصلہ کرنے کا حق دینا فکر و نظر کی زبردست کوتاہی ہے۔

اب قرآن کے بعد صحیح احادیث کی طرف رجوع کیجیے تو یہاں بھی اس کی کوئی مضبوط شہادت نہیں ملتی۔ کیونکہ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ طبقۂ اولی کی کتب احادیث میں ظہور مہدی سے متعلق ایک روایت بھی موجود نہیں ہے۔ نہ تو امام بخاری نے ان روایتوں کو قبول کیا ہے، نہ امام مسلم نے، اور نہ امام مالک نے۔ دوسری طرف ان روایتوں میں بھی، جنہیں بعد کے ائمۂ حدیث نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، شاید ہی کوئی روایت ایسی ہو گی جو محدثانہ معیار تحقیق پر بالکل بے داغ ثابت ہوتی ہو اور اس کا کوئی نہ کوئی راوی شیعہ یا شیعیت سے متاثر نہ نکلتا ہو۔ ان وجوہ سے

بعض علماء نے تو ظہور مہدی کی پیش گوئی یا بشارت کے تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ رائے ایک محتاط رائے نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ معاملہ جس اہمیت کا ہے اس کے پیش نظر اس کی روایت زیادہ مضبوط سندوں سے ہونی چاہیے تھی۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس معاملہ کی کوئی خاص دینی اہمیت تھی نہ آپ کے علوم وارشادات کو باقی امت تک منتقل کرنے والے صحابہؓ کے نزدیک۔

لیکن ان تمام باتوں سے اگر صرفِ نظر بھی کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اس خبر کا ان ذمے داریوں سے آخر تعلق کیا ہے جو اہل اسلام پر اقامتِ دین کے ضمن میں عائد ہوتی ہیں؟

اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہی تو ہے کہ اس دنیا کا نظام فنا ہونے سے پہلے ایک مبارک دور آئے گا جب سطحِ زمین کے ایک ایک گوشے سے ظلم اور فساد مٹ جائے گا، دنیا عدل سے بھر جائے گی، اور حضرت ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی طرح کی "خلافت علی منہاج النبوۃ" سارے عالم میں قائم ہو جائے گی۔ اس سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ بیچ کے زمانوں کے لیے ساری دنیا پر کفر اور طاغوت کی فرمانبرداری مقدر ہو چکی ہے۔ اس پیش گوئی میں تو کوئی دور کا بھی اشارہ اس امر کا موجود نہیں ہے کہ ابتدائے اسلام کی تیس سالہ خلافتِ راشدہ کے اختتام سے لے کر ظہور مہدی تک زمین کے کسی خطے پر بھی اللہ کا دین قائم نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے تاریخ گواہ ہے کہ اس دور سعید کے ختم ہونے کے ستر برس بعد ہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ہاتھوں مملکتِ اسلام میں قریب ویسی ہی بہار سعادت پھر آگئی جو اُس دور میں تھی، اور اس زمانے کو بھی خلافتِ راشدہ کا زمانہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جس پایہ کی ظہور مہدی والی یہ روایات ہیں قریب قریب اسی پایہ کی کچھ دوسری روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں مہدی موعود کے علاوہ اور ان سے پہلے، اقامتِ دین کی کچھ اور تحریکوں کے اٹھنے کی پیش گوئیاں کی گئی ہیں اور مسلمانوں پر ان کی حمایت واجب قرار دی گئی ہے مثال کے طور پر دو روایتیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) **اذا رایتم الرایات السود قد جائت من قبل خراسان فاتوها ولو حبرا علی الثلج فان فیها خلیفة اللّٰہ المهدی**

جب تم یہ دیکھنا کہ خراسان کی طرف سے کالے جھنڈے آرہے ہیں تو وہاں پہونچنا، اگرچہ تمہیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے اس لیے کہ ان کے اندر اللہ کا ہدایت یافتہ خلیفہ ہوگا۔

(۲) يخرج رجل من وراء النهر يقال له الحارث حراث على مقدمته رجل يقال له منصور يواطئ اويمكن لال محمد كما مكنت قريش لرسول الله صلى الله عليه وسلم وجب على كل مسلم نصره اوقال اجابتهٗ (ابوداؤد۔ جلد دوم)

ماوراء النہر سے "حارث حراث" نامی ایک شخص نکلے گا جس کے آگے (جس کا سپہ سالار) منصور نامی ایک آدمی ہوگا۔ وہ آلِ محمدؐ کے لیے قوت اور اقتدار پیدا کرے گا، جس طرح کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا تھا۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اس کی مدد کرے۔ یا یوں فرمایا کہ اس کی پکار پر لبیک کہے۔

یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ ان روایتوں میں جن اشخاص کے ظہور کی خبر دی گئی ہے ان سب سے مراد ایک ہی شخص، یعنی وہی "مہدی موعود" ہیں۔ کیونکہ موعود کا ظہور، جیسا کہ روایات کا بیان ہے، مدینہ منورہ سے ہوگا نہ کہ ماوراء النہر یا خراسان سے۔ اسی طرح ان کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہوگا، نہ کہ "حارث حراث" نیز یہ کہ وہ اہل عرب کے جلو میں نکلیں گے نہ کہ خراسانی یا تورانی افواج کو لے کر۔ پھر یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ ان روایات میں حصر ہو گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اُن تمام داعیانِ حق کی فہرست گنا دی ہے جو قیامت تک اقامتِ دین کا علم لے کر اٹھنے والے ہیں۔ اس کے بخلاف ان روایتوں میں صرف بعض افراد اور چند زمانوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور مقصود اس امر کی تاکید ہے کہ جب کبھی بھی ایسے مواقع پیش آئیں تو ہر مسلمان کا فرض ہوگا کہ اقامتِ حق کی اس مہم سے اپنے کو وابستہ کر دے۔

غرض ان روایات میں نہ صرف یہ کہ مہدیٔ موعود کے ماسوا بھی حق کے کچھ علمبرداروں کی آمد کی بشارت سنائی گئی ہے بل کہ ہر مسلمان پر واجب گردانا گیا ہے کہ سر کے بل چل کر ان کے پاس پہونچے اور ان کی اعانت واطاعت میں جان کی بازی لگا دے۔ کیا یہ بات بھی اس بے بنیاد تخیل کا کھوکھلا پن واضح نہیں کرتی کہ اب مہدیٔ موعود کے آنے سے پہلے قیامِ دین کی جدوجہد سے امت فارغ البال قرار پا چکی ہے؟

پھر اس مسئلہ پر اصولی حیثیت سے بھی غور کیجئے اور دیکھیے کہ ایک بنیادی فریضے کی خود اپنی نوعیت کیا چاہتی ہے؟ جب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقامت دین ہی ہر مسلمان کی زندگی کا تنہا مقصد ہے، جب اس فریضے کی خاطر جدوجہد کرنا ہی اس کے ایمان کی کسوٹی ہے، جب مومن کا اصل مزاج ہی یہ بتایا گیا ہے کہ باطل اور منکر سے اسے ابدی بیر ہے، اور اسے وہ دنیا کے

کسی گوشے میں بھی موجود دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا اور جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اتباعِ قرآن کے عہد کا سب سے پہلا اور سب سے آخری مطالبہ ہی یہ ہے کہ مسلمان کی سعی و جہد اس وقت تک نہ رکنی چاہئیے جب تک کہ دین حق کی کوئی ایک دفعہ بھی معطل ہو، یا زمین کا کوئی ایک ذرہ بھی باطل کے پاؤں تلے دبا پڑا ہو۔ تو ہر مومن کو اپنے طور جدو جہد لازماً کرنی ہی پڑے گی، اور ہر حال میں، ہر دور میں، ہر ماحول میں اور ہر جگہ کرنی پڑے گی۔ امام مہدی جب آئیں گے تو وہ فرض اپنا ادا کریں گے نہ کہ میرا اور آپ کا۔ ان کی تمام دوڑ دھوپ صرف اپنے اس بوجھ کو اتارنے کے لیے ہوگی جو اللہ رب العالمین کی طرف سے خود ان پر ڈالا گیا ہوگا، کسی دوسرے کا بوجھ اپنے سر نہ لیں گے اور نہ لے سکیں گے۔ اس لیے ان کی سعی و جہد کسی بھی دوسرے مدعی اسلام کے ادائے فرض کی قائم مقام نہ ہوگی جس طرح وہ کسی دوسرے کی طرف سے نہ تو نمازیں پڑھیں گے نہ روزے رکھیں گے اسی طرح وہ کسی کی طرف سے اقامتِ دین کی جدو جہد بھی نہ کریں گے۔ آپ تو آج ہی سے ان کی جدو جہد پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے ہیں، جب کہ ان کا وجود عالم تصور اور دنیائے آرزو سے باہر بھی نہیں آیا ہے۔ مگر یقین کیجئے کہ وہ اس وقت کے بھی کسی مسلمان کی طرف سے کوئی دینی فریضہ ادا نہ کریں گے جو اُن کے اپنے زمانے میں موجود ہوگا۔ اس وقت بھی ہر مسلمان کو اپنا ہر فرض ٹھیک اسی طرح خود ہی ادا کرنا ہوگا جس طرح کہ امام موصوف کو اپنا فرض۔ یعنی حضرت مسیحؑ کے لفظوں میں ''ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہوگی''۔ اور جو ایسا نہ کرے گا ''آسمانی بادشاہت'' میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہر مسلمان کو یہ دُعا اور یہ آرزو تو ضرور کرنی چاہیے کہ اس کو کوئی ایسا دورِ سعادت دیکھنا نصیب ہو جس میں ظلم و فساد کے بوجھ سے کراہتی ہوئی دنیا امن اور انصاف کی رحمتوں سے باغ و بہار بن جائے مگر کسی کو ایک لمحہ کے لیے بھی خوش فہمی کا یہ فریب نہ کھانا چاہیے کہ کسی آنے والے مرد کامل کے صدقے میں اب سارے مسلمان بندگی کی بنیادی ذمے داری، اقامتِ دین کی جدو جہد سے سبکدوش کر دیے گئے ہیں۔ ورنہ یہ کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا کہ عیسائی حضرات نے گمان کر رکھا تھا کہ مسیحؑ نے سولی پر چڑھ کر ہم پر سے عمل کی ذمے داریاں ساقط کرا دی ہیں۔

احتسابِ نفس کی ضرورت:

اقامت دین کی جدو جہد سے دامن بچانے کے حق میں جو مختلف ''فلسفے پیش کئے جاتے ہیں، اوپر کی مفصل معروضات میں ان کا اور ان کے استدلالی وزن کا حال آپ نے دیکھ لیا۔ اگر ان

معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور گروہی، سیاسی اور تقلیدی تعصّبات سے بالاتر ہو کر خالص حق پسندانہ نقطۂ نظر سے اپنے افکار و اعمال کا جائزہ لیا جائے تو توقع ہے کہ وہ تاریکیاں ضرور چھٹ جائیں گی۔

جو غفلت اور کج فکری کی بدولت نہ جانے کب سے ہمارے ذہنوں پر چھائی چلی آرہی ہیں اور جنہوں نے ہمارے مقصدِ وجود کو ہماری نگاہوں سے اوجھل بنا رکھا ہے۔ مگر بھولنا نہ چاہیے کہ نفس اپنا احتساب کرنے میں سخت حیلہ گر اور فریب کار واقع ہوا ہے۔ اس پر کسی غیر مانوس اور نا مرغوب حقیقت کا سامنا کرنا بڑا ہی شاق ہوتا ہے، اور اس حقیقت کے خلاف تو وہ اپنے ترکشِ دجل کا آخری تیر تک استعمال کر ڈالتا ہے جو اس سے قربانیوں کی طلب گار ہو، صرف جان اور مال ہی کی قربانیوں کی نہیں بل کہ جذبات و میلانات کی قربانیوں کی بھی، پندار علم و فہم کی قربانیوں کی بھی، سابق طرز عمل کی محبت اور عصبیت کی قربانیوں کی بھی، کہ بسا اوقات ان چیزوں کی قربانیوں سے بھی زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ ادھر سے نور حق کی تجلی دکھائی دیتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ سمت قبلہ یہی ہے ادھر نفس کے حیلے اور وسوسے اٹھتے ہیں اور انسان سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب تک کی تیری ساری ڈور دھوپ باطل کی راہ میں تھی؟ کیا زمانے کے شیوخ و اکابر اور وقت کے اربابِ علم و دانش جن راہوں پر چل رہے ہیں وہ سب کی سب "ترکستان" ہی کر طرف جاتی ہیں؟ یہ سوالات نفسیاتی حربوں سے ایسے مسلح ہوتے ہیں کہ انسان ان کا شکار ہو جانے سے بہت کم بچ پاتا ہے اور انجام کار ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اسے حق تسلیم نہیں کرتا۔ یہ نفس انسانی کی وہی جبلی کمزوری ہے جو ہمیشہ سے ہر دعوتِ حق کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ثابت ہوتی رہی ہے اور اس کے مطالبۂ اطاعت کے جواب میں بدبخت انسانوں کی زبان سے یہ آواز بلند کرتی رہی ہے کہ:۔

بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (البقرۃ:۱۷۰)

بل کہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

اس لیے اگر راہِ حق و صواب کی سچی طلب ہو تو ضروری ہے کہ نفس کی اس مہلک کمزوری اور دسیسہ کاری سے انسان پوری طرح چوکنا رہے اور اس عظیم اصول کو ہرگز نہ بھولے کہ حق و باطل کا معیار نہ تو کوئی شخص ہے۔ بجز ایک شخص کے جس کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اور نہ کوئی جماعت ہے۔ سوا ایک جماعت کے، جس کو دنیا اصحابِ محمدؐ کے نام سے پکارتی ہے۔ ورنہ وہ اپنے فکر و عمل کا بے لاگ احتساب کر ہی نہیں سکتا۔ اور جب تک یہ توفیق میسر نہ ہو، ہدایت یابی کی توقع

فضول ہے۔ اس لیے مسئلہ زیر بحث کے سلسلے میں صرف اللہ کی کتاب، اس کے رسول ؐ کی سنت اور اصحابِ رسول ؐ کا اُسوہ ہی ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ اگر حق اور ہدایت کے ان سرچشموں میں ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں بتایا گیا ہے کہ اس کا ہر سانس اقامتِ دین کے ذکر و کفر اور سعی و جہد میں بسر ہونا چاہیے، تو پھر اس کام کے لیے اپنے کو وقف کر دیجئے اور ہر اس چیز کو ٹھکرا دیجئے جو اس عزم کی مزاحمت کرے۔ خواہ وہ کسی پیر و مرشد کی ارادت ہو یا کسی شیخ و امام کی عقیدت، کوئی جماعتی رشتہ ہو یا اب تک کا طرز فکر و عمل۔ یہ چیزیں اگر اس صراط مستقیم پر قدم بڑھانے سے روکتی ہیں تو باور کیجئے کہ یہ سب نفس کے حجابات اور شیطان کے فتنے ہیں، اور قدرت نے ان کو انسان کے لیے صرف اس مقصد سے پیدا کر رکھا ہے کہ اس کی حق پرستی کی آزمائش ہو۔ مبارک ہے وہ بندہ جو، ان حجابوں کو چاک کر کے اور ان فتنوں کو کچل کر اپنے فرض کی پکار پر حرکت میں آجائے۔ ورنہ یاد رہے کہ کوئی عقیدت، کوئی ارادت، کوئی رشتہ اور کوئی تاویل بھی ہم کو خدا کی گرفت سے نہیں بچا سکتی۔ جب تک رازِ حق دل پر نہ کھلا ہو اس وقت تک تو انسان کسی حد تک معذور مانا بھی جا سکتا ہے مگر جب حقیقت بے حجاب نظر آگئی اور دل نے اس کی صداقت کا اعتراف کر لیا تو سمجھ لیجئے کہ اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور اعتذار کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ اب آگے یا تو آمادگیٔ عمل اور کامرانیٔ حیات ہے، یا پھر فرض کا انکار اور نامرادی کا عذاب، کیونکہ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے منھ موڑنا اس سنتِ فرعونی کی پیروی کرنا ہے جس کا تذکرہ قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا. (النمل۔ ۱۳۔ ۱۴)

جب ان کے سامنے ہماری واضح نشانیاں آئیں تو انہوں نے کہا یہ تو صاف جادو ہے، اور باوجود اس کے کہ ان کے دل ان نشانیوں کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے انہوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر ان کا انکار کر دیا۔

اور اس سنت کی پیروی کا جو انجام ہو سکتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

بلا شبہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کا ہر قدم کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر رضائے الٰہی کی منزل تک پہونچانے والی اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ اس لیے اگر اپنی دنیا کو برباد اور آخرت کو تباہ نہ کرنا ہو تو اسے اختیار ہی کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر کسی کے تلوے ان کانٹوں کا خیر مقدم

کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو اس کے لیے آخری چارہ کار جس کو برداشت کیا جاسکتا ہے صرف یہ ہے کہ وہ جہاں ہے وہیں قدم روکے کھڑا رہے۔ اور اگر کوئی پوچھنے والا اس سے پوچھے تو اسے اتنا ضرور بتادے کہ اگرچہ مجھے اس پر چلنے کی عملی توفیق حاصل نہیں، مگر حق اور نجات کی شاہراہ یہی ہے۔ یہ اس لیے تاکہ کل اللہ تعالیٰ کے حضور ترک فرض کے ساتھ ساتھ کتمانِ حق کے جرم میں بھی نہ پکڑا جائے۔ اور اگر بدقسمتی سے اس میں اتنی جرأت بھی نہ ہو تو پھر اپنے قدموں کی طرح اپنی زبان کو بھی روکے رہے، اور کسی حال میں بھی دوسروں کو اس راہ سے روکنے کا وبال اپنی گردن پر نہ لے۔ کیونکہ یہ رویہ کھلا ہوا "صد عن سبیل اللہ" ہے۔ اور صد عن سبیل اللہ ایک ایسی لعنت ہے جس کے تصور ہی سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جانے چاہئیں۔

اس موقع پر اس بحث میں جانا فضول ہے کہ آج اُمت مسلمہ کا کوئی فرد گروہ اس بدبختی میں مبتلا ہے یا نہیں؟ کیونکہ یہ صورت حال اگر آج موجود نہیں ہے تو کل موجود ہو سکتی ہے۔ یہ اندیشہ پیش رَوامت کے اس عملی ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے قطعاً بے بنیاد نہیں جس کی عکاسی حضرت مسیح علیہ السلام اپنی اس طرح کی تنقیدوں میں فرما گئے ہیں:۔

"اے ریاکار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو۔ کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہیں اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"۔

(متی باب ۲۳)

ویسے دُعا یہی ہے کہ خدا وہ دن کبھی نہ لائے جب کوئی مسلمان حق دشمنی کی اس لعنت میں مبتلا نظر آئے۔

پانچواں باب

اقامتِ دین کا طریقۂ کار

مقصد سے اصول کار کا فطری ربط:۔

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ ہماری زندگی کا عملی نصب العین دین حق کی اقامت ہی ہے اور کوئی تاویل یا عذر اس کی ذمہ داری سے ہمیں کبھی سبکدوش نہیں کر سکتا، تو اب پوری سنجیدگی اور اہمیت سے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نصب العین کے لیے جدوجہد کس طرح کی جائے؟ آیا اس کا کوئی مخصوص طریقہ کار ہے یا جس سمت سے چاہیں اس منزل مقصود کی طرف مارچ کر سکتے ہیں؟ جن لوگوں نے اجتماعیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا، وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ ہر جماعت کا، جو کسی مقصد کو لے کر اٹھی ہو، جس طرح ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص انداز فکر ہوتا، اسی طرح اس کی تشکیل، تنظیم اور تعمیر کا بھی ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ اس انداز فکر کی طرح اس انداز تعمیر کا تعین بھی وہی مقصد کرتا ہے۔ جس کو لے کر یہ جماعت اٹھی ہوتی ہے۔

اس اصولی حقیقت کو چند مثالوں سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے:۔

فرض کیجیے کہ آپ کو ایک قومی حکومت قائم کرنا ہے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو جو کچھ کرنا ہوگا وہ یہ ہوگا کہ آپ پہلے تو اپنے افرادِ قوم کے دلوں کو وطنی سربلندی اور قومی اقتدار کے عشق سے معمور کریں، ان میں اپنے اوپر آپ حکمراں ہونے کا عقیدہ اور عزم پیدا کریں۔ پھر قومی آن پر نثار ہو جانے کے لیے ان کے اندر سرفروشی کی آگ بھڑکائیں، اور اپنے محبوب مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انکی قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیں۔ جب یہ سب آپ کر لیں تو بس سمجھ لیجیے کہ کامیابی کی تمام شرطیں آپ نے پوری کر لیں۔ اب آپ کو یہ دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ میرے جھنڈے کے نیچے جو لوگ جمع ہیں وہ توحید کے متعلق، رسالت

کے متعلق، قیامت اور جزائے عمل کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں؟ ان کے اندر دین کی پابندی کتنی ہے؟ انہوں نے سچائی، رحمدلی، پاک دامنی، خوش خلقی، اور خدا ترسی جیسے اوصاف سے اپنے کو کہاں تک آراستہ کر لیا ہے؟ ان میں سے کسی چیز کے بھی دیکھنے کی آپ کو حاجت نہیں۔ کیونکہ جو مقصد اور نصب العین آپ کے سامنے ہے، اس کے لیے یہ چیزیں سرے سے مطلوب ہی نہیں ہیں۔ بل کہ شاید کچھ مضر ہی ہوں۔ یہاں تو جو چیزیں مطلوب ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ حریف طاقتوں سے اندھی دشمنی اور قوم سے اندھی محبت رکھئے اور اس دشمنی اور محبت میں سب کچھ کر گزریئے۔

اسی طرح اگر آپ ملک میں کمیونزم کا اقتدار اور کمیونسٹ نظام قائم کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو پہلے وہاں کے باشندوں کے ذہن میں کمیونسٹ فلسفۂ زندگی، کمیونسٹ نظام معیشت و حکومت اور کمیونسٹ نظریۂ اخلاق کی "خوبیاں" اتارنی ہوں گی۔ سرمایہ پرستی ہی نہیں بل کہ سرمایہ داری کے بھی خلاف دلوں میں شدید نفرت پیدا کرنی ہوگی۔ مارکس اور لنین کے ساتھ وہ عقیدت پیدا کرنی ہوگی جو خدا اور پیغمبر کے لیے اہلِ مذہب کے دلوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور خدا، رسول، آخرت، دین، اخلاق اور اعمال صالحہ کے الفاظ کو خود غرض سرمایہ پرستوں کے ہتھکنڈے قرار دے کر اور ان کے اثر کو ذہنوں سے مٹا کر خالص مادی تصور حیات اور حیوانی تصور کائنات ان پر ثبت کرنا ہوگا۔ پھر جب آپ یہ بنیاد جمالیں اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو ان خیالات اور نظریات کا گرویدہ بنالیں تو ان کا ایک جتھ بنا کر ایک طرف باقی عوام کو اپنے پروپیگنڈہ کے زور سے مسحور کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں، اور دوسری طرف خفیہ اور علانیہ تمام ممکن ذرائع سے موجودہ نظام حکومت کے تخت کو الٹنے کی مہم شروع کر دیں، تا آنکہ عوام کے ہاتھوں یہ تخت الٹ کر اشتراکی حکومت قائم ہو جائے۔

علیٰ ہٰذا القیاس اگر ایک شخص منظم طریقے پر رہزنی کرنا چاہتا ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے گا جو مضبوط جسم، بے خوف دل اور خونخوار فطرت رکھتے ہوں۔ ایسے آدمی اس کے کسی کام کے نہ ہوں گے جو نرم دل ہوں اور غارت گری و خونریزی سے متنفر ہوں۔ جب ایسے لوگوں کو وہ حاصل کر لے گا تو اِن "ضروری اور کار آمد صفتوں" کا ان میں مزید استحکام پیدا کرنے کی تدبیریں کرے گا۔ لوٹ مار کے انہیں گُر سکھائے گا، اسلحے مہیا کرے گا۔ تب کہیں جا کر اپنی مہم کا آغاز کر سکے گا۔

غرض دنیا کی ہر بامقصد جماعت کا یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو اس کے پیش نظر مقصد سے فطری لگاؤ رکھتے ہوں اور لازماً ایسے ہی طریق کار اور ایسی

ہی پالیسیاں اختیار کرتی ہے جو اس مقصد کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ "امت مسلمہ" کہلانے والی جماعت اور قیام دین کا مقصد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی ایک خاص طریقہ کار ہونا چاہیے آیئے دیکھیں وہ طریقِ کار کیا ہے؟

طریق کار کے مآخذ:

اس غرض سے جب ہماری نگاہ اٹھتی ہے تو قدرتاً وہ قرآن اور سنت ہی پر جاکر ٹھہرتی ہے کیونکہ جہاں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقامتِ دین ہمارا فریضۂ حیات ہے، حق یہ ہے کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے اصولِ کار بھی وہیں سے ملیں۔ کیا قرآن اور سنت نے ہماری اس ضرورت کو محسوس کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہر حیثیت سے مکمل اثبات میں ہے۔ اسلام سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والا بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن اور صاحبِ قرآن نے جس طرح امت مسلمہ کا مقصد وجود بالکل وضاحت سے بیان کر دیا ہے اسی طرح اس کے طریق کار کے بارے میں بھی انہوں نے کوئی حجاب باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ چنانچہ ہر اُس آنکھ کو جو اندھی نہ ہو، قرآن اور سنت کے صفحوں میں یہ طریق کار اسی طرح نمایاں اور روشن دکھائی دے سکتا ہے جس طرح اندھیری راتوں میں آسمان کے سینے پر جگمگاتی کہکشاں۔ قرآن، قرآن کے طریق نزول، اور صاحب قرآن کے اُسوے، تینوں سے اس طریق کار کی کھلی کھلی نشان دہی ہوتی ہے، جو کہنے میں تو تین الگ الگ وجود ہیں مگر زیر بحث مقصد کے اعتبار سے تینوں دراصل ایک ہی ہیں۔ قرآن کے نصوص کو چوں کہ اس معاملہ میں بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اور باقی دو چیزیں اسی کے توابع اور لوازم کا درجہ رکھتی ہیں اس لیے اقامتِ دین کے اصول و طریق کار کی بنیادی وضاحت بھی ہمیں اسی سے لینی چاہیے۔

اقامتِ دین کے قرآنی اصول:

قرآن کریم کو غور سے پڑھئے، تو وہ اصول و نکات بڑی آسانی کے ساتھ ہاتھ آجاتے ہیں، جن کے مطابق اقامتِ دین کی جدوجہد کی جانی چاہیے۔ بل کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان اصولوں کی تفصیل سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے، اور یہ ایک ایسی بات ہے جو توقع کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ جب اس کے مباحث کا اصل مرکز یہی اقامتِ دین ہے تو قدرتی طور پر اس کی ساری تفصیلات بلاواسطہ یا بالواسطہ اسی کے اصول و ذرائع کی شرح و تفصیل ہی ہوں گی۔ لیکن چوں کہ

قرآن اپنے مدعا کو انسانی ذہن میں پوری طرح بٹھا دینے اور اچھی طرح محفوظ کر دینے کے لیے کوئی ضروری تدبیر اٹھا نہیں رکھتا اور جہاں تک اقامت دین کے مسئلے کا تعلق ہے، وہ اس کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ تھا، اس لیے اس کے طریق کار کو اس نے جہاں سینکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کیا ہے اور مختلف جگہوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہاں بعض مقامات پر اس نے انہیں اکٹھے سمیٹ کر بھی بیان کیا ہے، تاکہ چند جملوں کے مختصر سے آئینے میں ان کی پوری تصویر بیک نظر بھی دیکھی جا سکے۔ اس طرح کے "جوامع الکلم" میں سب سے زیادہ جامع اور ساتھ ہی سب سے زیادہ واضح آیتیں یہ ہیں:۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

(آل عمران: ۱۰۲)

اے ایمان والو! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو اور دنیا سے نہ رخصت ہو مگر اس حال میں کہ تم "مسلم ہو"

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ.

(آل عمران: ۱۰۳۔۱۰۵)

اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور ٹولی ٹولی نہ ہو رہو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو تم پر ہوا ہے، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دل باہم جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔ اور چاہیے کہ تم وہ گروہ بنو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے، بدی سے روکتا رہے، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلاف میں مبتلا ہو گئے۔

یہ آیتیں مدینہ کی ابتدائی زندگی، یعنی ۳ ہجری میں نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے ابتدائی مرحلوں سے گذر رہی تھی۔ عین اس زمانے میں یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامتِ دین اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر

جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں۔ جس میں اقامتِ دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصول ہی بتادیے گئے بل کہ یہ بھی واضح فرمادیا گیا کہ ان اصولوں میں باہم ترتیب کار کیا ہونی چاہیے؟ نیز یہ بات بھی کہ اس نصب العین کی خاطر کی جانے والی جدو جہد کن تدریجی مرحلوں سے گذرتی ہوئی اپنی غایتِ مقصود تک پہونچا کرتی ہے۔ اس ربانی پروگرام پر غور کیجیے تو وہ تین اجزا یا اصولی نکات پر مشتمل دکھائی دے گا:۔

(۱) تقویٰ کا التزام (۲) مضبوط و منظم اجتماعیت (۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

یہی تین نکات ہیں جو اقامتِ دین کے بنیادی اصول کار ہیں۔ ان کو تفصیل کی روشنی میں دیکھیے:۔

(۱) تقویٰ کا التزام:

اقامت دین کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے اور جس کو اس راہ کی "شرط اول قدم" کہنا چاہیے۔ وہ اِتَّقُوْ اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَاتَمُوْتُنَّ اِلاَّ وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ کے فرمان خداوندی میں مذکور ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے کو "ایمان والا" سمجھتا ہو، اور جو اس ایمان کی عائد کی ہوئی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ اللہ کا "تقویٰ" اختیار کرے اور اپنے آخری سانس تک ہر آن اور ہر لحہ ایک "مسلم" بن کر زندگی بسر کرے۔ تقویٰ کا پورا عملی مفہوم جو قرآن کی زبان سے بیان ہوا ہے اس سے شمہ برابر بھی کم نہیں کہ اللہ کے تمام حکموں کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے، اس کے کسی امر کو چھوڑ دینے سے بھی ڈرا جائے، اور اس کی کسی نہی کے کر گذرنے سے بھی خوف کھایا جائے۔ اسی طرح مسلم کے معنی بھی قرآنی بیانات کی روشنی میں سچے فرماں بردار اور مخلص اطاعت شعار کے ہیں۔ یعنی مسلم وہ شخص ہے جس نے احکامِ خداوندی کے سامنے اپنی گردن رضا کارانہ جھکا دی ہو۔ اس لیے ان دونوں اصطلاحوں کے مفہوموں کے پیش نظر اقامتِ دین کے پروگرام کا پہلا جزو، یا اصول یہ ہوا کہ ہر مسلمان سب سے پہلے خود اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرے۔ خوف و رجا کی ساری نیاز مندیاں بس اسی ایک ذات کے لیے مخصوص کر دے۔ تعظیم و تذلل اور سرفگندی کے تمام جذبات اسی کی رضا جوئی کے لیے وقف کر دے۔ تمام اطاعتوں سے منھ موڑ کر بس اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔ اپنے نفس کو ان تمام امور سے پاک کرے جو اس کی ناخوشی کا سبب بنتے ہیں اور ان تمام صفات سے اسے آراستہ کرے جو اس کی رضا کے باعث ہوتے ہیں۔ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی غلام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجا آوری میں نہ تولیت و لعل کرے اور نہ دل تنگ ہو۔

اپنی نگاہ کو حق تعالیٰ کی رضا طلبی اور حکم برداری پر پوری طرح جمائے رہے۔ خواہ کتنی ہی مخالفتیں، مصیبتیں، ناسازگاریاں اور دل شکنیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں۔ کیونکہ یہ چیزیں اگرچہ بظاہر مشکلات و مصائب ہی ہیں، مگر فی الواقع یہ اتباع حق اور التزام تقویٰ کی ضروری آزمائشی منزلیں ہیں، جن سے گذرے بغیر کسی مدعیٔ ایمان کا اور تقویٰ خدا کے ہاں سندِ اعتبار اور شرفِ قبول نہیں حاصل کرتا۔ جیسا کہ قرآن کا فرمانا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ (البقرۃ:۱۵۵)

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ.

(العنکبوت:۲۔۳)

ہم تم کو (یعنی تمہارے ادعائے ایمان کو) خطروں اور فاقوں اور تمہارے مال اور جان اور پیداوار کے نقصانوں کے ذریعہ ضرور آزمائیں گے۔ اور اے نبیؐ ان لوگوں کو (کامرانی کا) مژدہ سنا دو (جو ان خطرات و نقصانات کو) صبر و ضبط کیساتھ برداشت کر لیں۔ کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور نہیں پرکھا جائیگا حالانکہ (یہ پرکھنا ہماری ہمیشہ کی سنت ہے) اور ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے لہذا تمہیں بھی اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے (مومن) ہیں اور کون جھوٹے۔

اس لیے ان چیزوں سے گھبرانے اور کترانے کے بجائے ان کا صبر اور اطمینان کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہو سکتا جو ان رکاوٹوں کے آگے سپر ڈال دے، اور نہ وہ سینہ تقویٰ کے نور سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے، جو اس آزمائش کی ہمت نہ رکھے۔ اپنے ایمان و اسلام کے متعلق بڑے دھوکے میں ہو گا وہ شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے نام نہاد جانی اور مالی، گروہی اور طبقاتی، قومی اور وطنی مفادات کا بچاؤ پہلے کر لینے کی فکر کرے، اور اتباعِ حق کو جان و مال کی کامل محفوظیت کے ساتھ مشروط رکھے۔۔۔ ایسے شخص کی زبان پر اسلام، اور اس کی شکل و صورت میں تقویٰ تو ہو سکتا ہے، مگر اس کا باطن ان طائرانِ قدس کا آشیانہ نہیں ہو سکتا۔ غرض اہل ایمان کی آزمائش اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے۔ اور اسی سنت کو

پورا کرنے کے لیے اس نے اسلام اور اتقاء کا راستہ مشکلات اور مصائب کی چٹانوں سے بھر رکھا ہے۔ اس لیے جو شخص اِتَّقُوْا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کے فرمانِ الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو، اس کو ان چٹانوں سے ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

(۲) منظّم اجتماعیت:

اس پروگرام کی دوسری دفعہ یا دوسرا نکتہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کے الفاظ میں بیان ہوا ہے، ان لفظوں میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے وہ دو باتوں پر مشتمل ہے: ایک تو یہ کہ وہ تمام اہلِ ایمان جو احکامِ الٰہی و حدودِ خداوندی کی پابندی میں سرگرم اور اپنی انفرادی اصلاح و تزکیہ میں کوشاں ہوں مل کر ایک مضبوط و منظّم جماعت بن جائیں۔ اور یہ پوری جماعت ایک ہی جسم کے اعضاء کی طرح باہم جڑی ہوئی ہو۔ دوسری یہ کہ اسے اس طرح باہم جوڑ کر رکھنے والی چیز نہ کوئی نسلی رشتہ ہو نہ کوئی وطنی تعلق، نہ کوئی معاشی یا سیاسی مفاد ہو نہ کوئی دنیوی اور مادّی مقصد، بل کہ صرف "اللہ کی رسی" یعنی اس کی بندگی کا وہ عہد ہو جو، ہر مسلمان نے کر رکھا ہے، وہ قرآن ہو جس کی پیروی ہی کسی شخص کو مومن بناتی ہے، وہ دین ہو جس کی اطاعت و اقامت ہی کے لیے امتِ مسلمہ وجود میں لائی گئی ہے۔ غرض جس طرح ملت کا منظّم اور متحد رہنا ایک ضروری چیز ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس نظم و اتحاد کا شیرازہ صرف "یہ حبل اللہ" ہی ہو۔ بل کہ اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات اس سے بھی کہیں زیادہ اہم نظر آئے گی، اتنی زیادہ اہم کہ مجبوری کی بعض ایسی حالتیں تو ہو سکتی ہیں، جن میں اتحاد و تنظیم سے محروم ہو کر بھی مومن خدا کے حضور معذور اور بری قرار پا جائے گا، مگر جو چیز اس اتحاد و تنظیم کا شیرازہ ہے اسے کسی حالت میں بھی اگر چھوڑ دیا گیا تو اس کی باز پرس سے چھٹکارا ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اس لیے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام کے نزدیک نفس اتحاد ہی کوئی مطلوب و محبوب چیز ہے خواہ وہ کسی غرض کے لیے اور کسی مقصد پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کا مطلوب نہیں بل کہ اس کی نظروں میں حد درجہ مردود اور مبغوض ہے، اور اُس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ صرف اس اتحاد کا ہے جس کا شیرازہ اتباعِ حق اور اقامتِ حق ہو۔

اقامتِ دین کا یہ نکتہ، یعنی جماعتی اتحاد، اگر ذرا غور کیجیے تو پہلے نکتہ سے کوئی بالکل الگ اور بے تعلق چیز نہیں ہے بل کہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ایک طالب علم کو اس کی اپنی طبیعت

ہی مجبور کرتی ہے کہ اپنے ساتھی طلبہ سے بے تکلفی، دل بستگی اور الفت و محبت رکھے۔ ایک تعلیم یافتہ اور علم دوست کے مذاق اور مزاج ہی کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ ارباب علم و دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف خود بخود کھنچ اٹھنے سے رُک نہیں سکتا۔ اور اگر کسی طالب علم کو اپنے ساتھیوں سے کسی صاحب علم کو اہل علم و فضل سے، کسی رنگین مزاج کو اہل نشاط سے گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں طالب علم اور صاحب علم اور رنگین طبع نہیں۔ ہم مشربی کی یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح میں جاذبہ جنسیت، کہا جاتا ہے۔ اصولاً اس جاذبہ جنسیت کو اہل تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرنا چاہیے اور وہ کرتا بھی ہے۔ ایک وہ انسان جو خدا پرستی کے جذبات سے سرشار ہو ان لوگوں کی طرف لازماً کھنچتا ہے، جو اسی کی طرح اتباعِ حق اور تقویٰ کے لذت شناس ہوں۔ یہ ممکن نہیں کہ دو دلوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو اور اس کے باوجود وہ آپس میں کٹے ہوئے یا ایک دوسرے سے بے تعلق ہوں۔ اس کے بہ خلاف ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تقویٰ کی صورت میں اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے کیونکہ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے غیر بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے، جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف اگر کہیں اِنَّمَا الْمُوْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ اور بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ کے الفاظ سے کی گئی ہے تو کہیں رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ اور اَذِلَّةٍ عَلَے الْمُؤْمِنِيْنَ ان کا نشانِ امتیاز ٹھیرایا گیا ہے۔ گویا اسلام کے پیروؤں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔ قرآن کی نگاہ میں اہل ایمان کے لیے اس وصف کا وجود کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس چیز کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بعض اُن ہدایات پر بھی نظر ڈال لی جائے جو اس معاملے کے منفی پہلو سے تعلق رکھتی ہیں ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآئَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (التوبۃ: ۲۳)

اے ایمان لانے والو! اگر تمہارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو اپنا ولی (قلبی رفیق) نہ بناؤ اور جو لوگ ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچا مومن اور متقی دوسرے مومنوں سے بے تکلفی نہیں رکھ سکتا خواہ نسلی اور خواہ قومی لحاظ سے وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح وہ فساق و فجار سے قلبی

رابطہ بھی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس کے امکان کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، جیسا کہ اسی ضمن کی ایک اور آیت صراحت کرتی ہے:۔

لَا تَجِدُ قَوْماً يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَ هُمْ اَوْ اَبْنَاءَ هُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْعَشِيْرَتَهُمْ (المجادلۃ: ۲۲)

تم کسی ایسے گروہ کو، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، ان لوگوں سے الفت و مودت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی عداوت اور مخالفت پر کمر بستہ ہوں خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ یا بیٹے یا بھائی یا اہلِ خاندان کیوں نہ ہوں۔

ان ارشادات سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ایمان کے رشتے کو انسانی تعلقات میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک طرف تو مختلف نسلوں اور قوموں کے افراد کو باہم بھائی بھائی بنا کر جوڑ دیتا ہے۔ دوسری طرف اس کی زبردست قوت تمام مادی رشتوں کو بے جان اور غیر مؤثر بنا کر رکھ دیتی ہے۔ گویا یہ ایک سورج ہے جس کے آگے تمام ستارے بے نور ہو کر رہ جاتے ہیں پھر ایمان کا یہ منفی اثر و عمل اس کے مثبت اثر و عمل کو مزید طاقت بھی دے دیتا ہے اور اہل ایمان کے مابین قائم ہونے والے اتحاد کو اور زیادہ مستحکم بنا دیتا ہے۔

غرض ایک نصب العین کی علمبردار اور ایک اصول کی پیرو دوسری جماعتیں جس حد تک اپنے ارکان کو ڈسپلن کی مضبوط بندشوں میں باندھ کر رکھتی ہیں" اللہ کا دین اپنے پیروؤں کو اس سے بھی زیادہ مضبوطی سے جڑ جانے کی زبردست ہدایت کرتا ہے۔ انتشار و اختلاف کو وہ انتہائی مذموم ٹھہراتا ہے اور دین حق کے مزاج کے اسے یکسر خلاف قرار دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک پیغمبر (حضرت ہارون علیہ السلام) نے اپنی قوم کی اکثریت کو علانیہ بت پرستی میں مبتلا ہو جاتے دیکھا مگر انہیں صرف سمجھانے بجھانے ہی پر اکتفا کیا، اور ان کے خلاف کوئی فوری قدم اٹھانے سے محض اس لیے احتراز کر گئے کہ کہیں قوم کی جمعیت پراگندہ نہ ہو جائے۔ اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سینا کی پہاڑی سے واپس آکر ان سے اس سلسلے میں سختی سے باز پرس کی تو انہوں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ۔ (میں اس بات سے ڈرا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی)

(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر:

اقامت دین کے پروگرام کی تیسری بنیاد وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کے ارشاد میں واضح کی گئی ہے۔ جس کی تفصیل یہ

ہے کہ انفرادی حیثیت سے اپنی اپنی ذات کے اوپر دین حق کا قائم کر لینا اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بن جانا ہی کافی نہیں ہے، بل کہ ان دونوں باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اُس "خیر اور معروف" کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود قبول کیا گیا ہے، اور اس "منکر" کو اپنے مقدور بھر مٹا ڈالنے کی مسلسل کوشش جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشہ میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اقتدار باقی نہ رہ جائے۔

جس طرح اقامتِ دین کے عملی پروگرام کی دوسری دفعہ (افراد امت کا منظم اتحاد) پہلی دفعہ (انفرادی صلاح و تقویٰ) کا لازمی تقاضا ہے اسی طرح یہ تیسری دفعہ (امر بالعروف و نہی عن المنکر) بھی اس کا فطری مقتضا ہے، نہ کہ کوئی ایسا مستقل بالذات حکم جو اس سے کسی طرح کی مزاجی مناسبت رکھتا ہی نہ ہو۔ یہ بات کہ امر بالمعروف کس طرح ایمان اور تقویٰ کی فطری طلب ہے، ایمان اور تقویٰ کی حقیقتوں پر غور کرنے سے بآسانی واضح ہو جاتی ہے۔ ایمان اور تقویٰ کی حقیقی روح کیا ہے؟ صرف اللہ تعالیٰ کی محبت بھری تعظیم کوئی محبت بھری تعظیم۔ محبوب کی مرضیات کے بارے میں کیا چاہے گی؟ صرف یہ کہ گرد و پیش انہی کی کار فرمائی ہو، ورنہ اس دل کو سوز محبت سے آشنا کون کہہ سکتا ہے جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا ہوا دیکھ کر تڑپ نہ اٹھے؟ اس لیے خدا کی محبت اور حق کی جاذبیت ایک خدا پرست کو چین سے ہرگز بیٹھنے نہیں دے سکتی، جب تک صفحۂ ارض پر اس کی نگاہوں میں چبھنے کے لیے ایک باطل اور کھٹکنے کے لیے ایک منکر بھی موجود ہو۔ یہ بات اس کے اسلام اور ایمان کے یکسر منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین اللہ کے حلقۂ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرماں بردار دیکھے اور ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کر لے۔ لہٰذا اقامتِ دین کا فریضہ ادا نہیں ہو سکتا اگر پیروان اسلام کی جمعیت امر بالمعروف سے غافل ہو۔ اور اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ کا حکم تشنۂ تعمیل ہی رہ جائے گا اگر اہل ایمان بس اپنی ذات ہی تک احکام الٰہی کی پیروی کو کافی سمجھ لیں اور ان کو اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر جا رہی ہے۔

اس کے علاوہ امر بالمعروف مومن اور مسلم اور متقی ہونے کے فطری تقاضوں میں ایک اور پہلو سے بھی داخل ہے، اور وہ ہے اللہ کے بندوں سے اخوت، محبت اور خیر خواہی کا پہلو۔ جو شخص اسلام کو جانتا ہے وہ یہ بات بھی جانتا ہو گا کہ خدا سے محبت کرنے کا حق اس وقت تک ہرگز ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی مخلوق سے بھی محبت نہ رکھی جائے، اس مخلوق سے جسے اس کے رسول نے اس کی "عیال" کہا ہے (اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰهِ (بیہقی) اور جس کی بہی خواہی کو ایمان کی

نشانی ٹھہرایا ہے (لَا یُؤْمِنُ اَحَدُ کُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ ۔ مسلم) نوعِ انسانی کے ساتھ بھی خواہی کی شکلیں بہت سی ہیں مگر اس سے بڑی اُس کی اور کوئی بھی خواہی نہیں کہ اسے ان راستوں سے بچایا جائے جو گمراہی اور ابدی ہلاکت کے راستے ہیں اور جن پر چل کر انسان کی دنیا بھی عذاب بن جاتی ہے، اور آخرت بھی۔ اس لیے ایک مومن اگر اپنے دوسرے ابنائے جنس کو "منکرات" سے روکنے اور خیر و معروف کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ دراصل کسی خارجی سبب کے تحت نہیں کرتا، بل کہ اپنے اس جذبۂ خیر خواہی کے تحت کرتا ہے جو اس کے ایمان کا پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح اس کا ایمان اسے اس بات پر ابھارتا رہتا ہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلائے، ننگوں کو کپڑے پہنائے اور کمزوروں اور بیکسوں کی مدد کرے، اسی طرح، مگر اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ، وہ اسے اس بات کے لیے بھی بے چین رکھتا ہے کہ حق سے محروم بندگانِ خدا کو اس خزانۂ سعادت کی کنجیاں مہیا کردے جس کے پا لینے کے بعد پھر کبھی وہ نہ بھوکے ہوں گے، نہ ننگے (اَنْ لَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی) نہ انہیں اپنے مستقبل کا کوئی اندیشہ لاحق ہوگا نہ اپنے ماضی اور حال کا کوئی غم (لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ) اس کی ایمانی فکر و نظر اسے بتاتی رہتی ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ اگر یہ بنیادی اور مقدم ترین خیر خواہی نہ کی گئی تو باقی ساری ہمدردیاں اور خیر خواہیاں بالکل ہیچ ہیں، اور ان سے خدا کے بندوں کے حقوق ہرگز ادا نہ ہوں گے اور خدا کے بندوں کے حقوق کا ادا نہ ہونا خود اس کے حقوق سے عہدہ برآنہ ہونے کی دلیل ہے۔

ایمان، اسلام اور تقویٰ سے امر بالمعروف کے یہ دو داخلی اور فطری تعلق تھے۔ ان کے علاوہ ان سے اس کا ایک خارجی اور مصلحتی تعلق بھی ہے، جسے ہم دعوتِ اسلامی کا سیاسی مفاد کہہ سکتے ہیں یعنی امر بالمعروف ایمان و اسلام کا فطری مطالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ایک سیاسی ضرورت بھی ہے اور وہ یہ کہ دعوتِ اسلامی کا علمبردار گروہ امر بالمعروف کا فریضہ بجا لا کر ہی اپنے ایمانی جوہر کو پوری طرح برقرار رکھ سکتا اور اپنے مقصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہو سکتا ہے اس کے مختلف وجوہ ہیں۔

(۱) اقامتِ دین کی عملی جدوجہد لازماً حق و باطل کی ایک طویل اور شدید جنگ کا دوسرا نام ہے۔ مقابلوں اور لڑائیوں کے متعلق فطرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو اقدام کی عملی جرأت رکھتا ہو۔ بقا و ارتقاء صرف پیش قدمی میں ہے۔ زبردست سے زبردست فوج بھی اپنے آپ کو شکست کی ذلت سے نہیں بچا سکتی اگر وہ دشمن سے مقابلے کے وقت اس پر آگے بڑھ کر حملے کرنا نہ جانتی ہو اسی طرح کوئی تحریک بھی زوال و انحطاط کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکتی اگر وہ صرف اپنی داخلی تعمیر و تنظیم ہی میں مصروف رہے اور اپنے بیرونی ماحول کی تسخیر کی

مہم سے غافل ہو۔ اس لیے وہ جماعت جو اللہ کا دین قائم کرنے کے لیے کوشاں ہو اس وقت تک کامیابی کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ طاغوتی مورچوں پر مسلسل حملے نہ کرتی رہے۔ اور وہ اسلحہ جس سے یہ حملے کئے جا سکتے ہیں صرف امر بامعروف و نہی عن المنکر کا اسلحہ ہے۔

(۲) جس طرح ایک جاندار کا جسم مختلف وجوہ سے کچھ نہ کچھ برابر تحلیل ہوتا رہتا ہے اور اسے اپنی اصل طاقت غریزی کو بحال رکھنے کے لیے غذاؤں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، تاکہ وہ اس کی رگوں میں تازہ خون پہونچا کر اس کی زائل شدہ قوت کو واپس لاتی رہیں، اسی طرح اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف گروہ کو بھی ایسے مختلف اسباب اور حالات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے جو اس کی توانائی کو متاثر کر دیا کرتے ہیں۔ اس لیے اسے بھی اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ایمان کو قوت بخش غذائیں دی جائیں، جو اس کے اندر خدا پرستی کی توانائیاں تازہ بتازہ داخل کرتی رہیں، تاکہ وہ برابر چست رہے، فعال رہے اور ترقی کرتا رہے۔ ورنہ رفتہ رفتہ اس کی قوت مرجھاتی چلی جائے گی، اور خود اس کے اپنے اوپر سے بھی دین کا اقتدار ڈھیلا ہوتا چلا جائے گا۔ ان "قوت بخش غذاؤں" میں سے جن سے یہ ایمانی توانائیاں حاصل ہوتی ہیں۔ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بھی ایک بہترین "غذا" ہے۔

(۳) یہ کائنات اور اس کی ہر شے طبعاً متحرک پیدا کی گئی ہے، ٹھہراؤ سے اس کی فطرت ناآشنا ہے۔ اس لیے وہ کسی ایک حالت پر رکی نہیں رہ سکتی۔ بل کہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی سمت حرکت کرتی رہے۔ اسے اگر آگے بڑھنے کا موقع نہ ملے گا تو لازماً پیچھے ہی ہٹنے لگے گی۔ یہی "قانونِ حرکت" قیام دین کے بارے میں بھی کام کرتا ہے۔ اس کو ایک زندہ اور فاتح تحریک کی شکل میں برابر آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ ورنہ جہاں اس میں رکاؤ پیدا ہوا اور اس کی اقدامی حرکت، جمود سے بدلی، وہ پیچھے ہٹنا شروع کر دے گا۔ اس اقدامی حرکت کی ایک ہی عملی شکل ہے، جس کا نام امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

یہ ہیں وہ مختلف داخلی اور خارجی پہلو جن کی بناء پر امر بالمعروف، ایمان اور اسلام اور تقویٰ ہی کا ایک قدرتی مطالبہ ہے۔

نبویؐ طریقِ کار کی شہادت:

اقامتِ دین کا یہ طریقہ اور اس کے یہ اصول تو ہمیں قرآن سے ملتے ہیں۔ اب اگر آپ قرآن کے معلم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کئے ہوئے طریق کار پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ وہی اصول جو قرآن کے اندر الفاظ کے لباس میں تھے، یہاں عمل اور واقعہ کی شکل میں موجود ہیں، اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیک انہی لائینوں پر ایک امت بنا کر اللہ کے دین کو قائم کیا تھا۔

آپؐ نے عرب کے اندر جس میں چپہ چپہ "دینِ" طاغوت کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا، اپنی سعی و جہد کی ابتدا ایک کلمے سے کی۔ جس کا عملی مفہوم یہ تھا کہ انسان اپنے تمام افکار و خیالات ، جذبات و میلانات، اور اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات کو اس اللہ کے تابع فرمان بنا دے جس کے سوا اس زمین پر کسی کو اپنی مرضی منوانے اور اپنا حکم چلانے کا استحقاق نہیں۔ یہ نامانوس آواز جن بہرے کانوں سنی گئی اور اس کو دبانے کے لیے جن انسانیت سوز مظالم سے کام لیا گیا ان سے کوئی صاحبِ نظر ناواقف نہیں ہے۔ سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں، وطنی مفاد نے آڑے آنے کی کوشش کی، وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مصلحتوں نے دامن پکڑا، مشکلات نے راستہ روکا۔ ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا۔ مگر اللہ کے اس بندے نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہیں آنے دی۔ اور حالاتِ زمانہ، رفتارِ واقعات اور مستقبل کے امکانی خدشات، غرض ہر چیز سے آنکھیں بند کر کے برابر اسی حقیقت کو دوسروں پر کھولتا رہا، جو خود اس پر کھل چکی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے عقیدۂ توحید اور تصور زندگی میں بالکل اکیلا تھا، اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہ کیا کہ اس عقیدے اور تصور کو چھپائے رکھے، حالانکہ پوری دنیا اس کی زباں بندی پر کمر بستہ تھی۔ بالآخر اس دعوتِ حق نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور، جن لوگوں کے اندر قبولِ حق کی صلاحیتیں ابھی زندہ تھیں وہ ایک ایک دو دو کر کے آپؐ کے حلقۂ اطاعت میں آنے لگے۔

آپ نے ان کے اندر سب سے پہلے خدائے واحد کی غلامی اور پرستش کا گہرا نقش بٹھایا۔ اور اصولی طور پر ان کو یہ بات سمجھادی کہ صرف رضا اسی کی چاہو۔ کیونکہ وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بھی عطا کی ہے اور زندگی بسر کرنے کا سامان بھی دیا ہے، اور حکم صرف اسی کا مانو، کیونکہ اس کے سوا سب تمہاری ہی طرح عاجز اور غلام ہیں۔ اس طرح اپنی مسلسل تعلیم و تربیت سے آپؐ نے ان کے دلوں کو ایک خدا کی بندگی کا ایسا گرویدہ بنا دیا کہ دینِ توحید کے دشمنوں نے اپنے ترکشِ ظلم و انتقام کے سارے تیر خالی کر دیے مگر کسی بندۂ مومن کا دل توحید کی محبت سے خالی نہ کر سکے۔

اس تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے ساتھ ان سب لوگوں کو، جو حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے جا رہے تھے، آپؐ ایک خاندان کے افراد کی طرح باہم جوڑتے گئے۔ یہ اخلاقی طور سے اتنا پائیدار تھا کہ بھائی بھائی کے رشتے اس کے سامنے ماند پڑ گئے اور آگے چل کر اجتماعی و سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی اتنا منضبط نکلا کہ آج تک دنیا کی کوئی تنظیم اس کی یکتائی کو چیلنج نہ کر سکی۔ اس سلسلے میں آپ نے اہل ایمان کو جو غیر معمولی ہدایتیں دیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اور پھر، جس طرح ان ہدایتوں پر انہوں نے عمل کیا وہ بھی دنیا پر روشن ہے۔ زندگی کے پیش آمدہ مسائل اور معاملات میں، جس

موقع پر بھی منظم اجتماعیت کا کوئی رنگ پیدا کرنے کی گنجائش نظر آئی، آپؐ نے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، خواہ معاملہ کتنی ہی معمولی قسم کا کیوں نہ ہوتا۔ حد یہ ہے کہ اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر پر بھی جاتے تو آپ کی ہدایت ہوتی کہ وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں اور اس کی سرکردگی میں سفر کریں (اِذَا کَانَ ثَلَاثَةٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُئَومِّرُوْا اَحَدَ هُمْ. (مشکوٰۃ) مسلمانوں کے ذہن میں اس طرح اجتماعیت کی اہمیت پیوست کرتے اور انہیں ایک جسم کے اعضاء کی طرح باہم جوڑتے ہوئے آپ نے اس امر کا بھی پورا اہتمام فرمایا کہ افتراق و انتشار کے عوامل اس اتحاد میں رخنے نہ پیدا کرنے پائیں۔ اس غرض سے آپ نے انہیں پوری طرح متنبہ کر دیا کہ امت کا یہ اتحاد و ائتلاف عام قسم کی صرف ایک "سیاسی" ضرورت نہیں ہے بل کہ یہ ایک خالص دینی ضرورت ہے، اور اس کے بغیر وہ کام کسی طرح پورا ہی نہیں ہو سکتا جس کے لیے میری بحیثیت ایک نبی کے، اور تمہاری بحیثیت ایک امت کے بعثت ہوئی ہے۔ اللہ کی نصرت بھی تمہارے سروں پر اپنا سایہ اسی وقت ڈالے گی جب تم جماعت (ایک منظم پارٹی کی شکل میں رہو (یَدُ اللّٰهِ عَلَی الْجَمَاعَةِ) اگر کوئی شخص اس جماعتی نظم سے بالشت بھر بھی الگ ہو گیا تو گویا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا قلادہ نکال پھینکا (مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِیْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ اِلَّا اَنْ یُّرَاجِعَ۔ ترمذی) اور اسی علیحدگی کی حالت میں اگر وہ مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی (مَنْ مَّاتَ وَهُوَ مُفَارِقٌ لِلْجَمَاعَةِ مَاتَ مِیْتَةَ الْجَاهِلِیَّةِ (مسلم) ملت کے مقدس شیرازے پر جو شخص بھی افتراق کی قینچی چلانے کی کوشش کرے اس کی گردن مار دینا (مَنْ اَرَادَ اَنْ یُّفَرِّقَ اَمْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَهِیَ جَمِیْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّیْفِ کَائِناً مَّنْ کَانَ (مسلم)

ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہلِ ایمان اللہ کے دین کو اس کے دوسرے بندوں تک پہونچانے میں برابر مصروف رہتے۔ اور جس کسی کو جاہلیت کی نجاستوں میں آلودہ پاتے اسے ان سے پاک کر کے ایک خدا کا پرستار، ایک آقائے حقیقی کا غلام اور ایک حاکم مطلق کا محکوم بنانے کی کوشش کرتے رہتے۔ جس بدی کو دیکھتے اس کو مٹانے کے درپے ہو جاتے۔ اور کفر و فساد کے جس طوفان سے رحمت حق نے انہیں نجات دی تھی اس میں دوسروں کو ڈوبتے دیکھنا انہیں کسی حال میں بھی گوارا نہ ہوتا۔ یہ دعوتی جدوجہد مکہ میں تیرہ برس تک چل پائی تھی کہ دشمنان حق کے لیے اس کی کامیابی اور روزافزوں ترقی ناقابل برداشت ہو گئی اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کر کے اس دعوت کو فنا کر دینا چاہا۔ اس لیے آپؐ نے اور آپؐ کے سچے پیرووں نے اپنے عزیز وطن کو خیر باد کہہ دیا اور مدینہ جا کر اسے اپنے مشن کا مرکز بنایا۔ جب کفار نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور اِدھر اہلِ ایمان کی ایک منظم جمعیت

بھی فراہم ہو چکی تھی، تو اب بدی کی جڑیں کاٹ کر رکھ دینے اور نیکی اور انصاف کی بقا کے لیے آخری شکل اختیار کی گئی۔ یعنی منکر کو مٹا دینے کے لیے دل اور زبان کی کوششوں کے علاوہ اب "ہاتھ" کی بھی کوششیں شروع کر دی گئیں۔ ایک مدت تک تو طاغوتی طاقتیں خود بڑھ بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ اور آپؐ اور آپؐ کے ساتھی صرف مدافعت کرتے رہے۔ اس مدافعت میں انہوں نے جان و مال کی ہر ممکن قربانی دے کر حق کی شہادت ادا کی یہاں تک کہ اس مدافعانہ پالیسی ہی کے دوران کفر کی شوکت ٹوٹنے لگی۔ اور آخر کار عرب میں طاغوت کا علم سرنگوں ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مسلمانوں کا دل اللہ کی تائید و نصرت پر شکر اور مسرت کے جذبات سے بھر گیا۔ مگر اس کے باوجود ان کے لیے اپنی کمریں کھول لینے کا ابھی کوئی موقعہ نہ تھا۔ اس لیے ان کی سواریوں کے کجاوے اسی طرح بندھے کے بندھے رہے۔ کیونکہ اگرچہ عرب میں بدی نے ہتھیار ڈال دیے تھے، مگر اس کے باہر ہر طرف اس کی حکمرانی پوری شان کے ساتھ قائم تھی اور مسلمان اپنے اس فرض کو بھول نہیں سکتے تھے کہ منکر کو مٹا دینا چاہیے خواہ وہ کہیں بھی ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ :

ان تفصیلات سے یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید ہو یا سنتِ رسول، ہر ایک سے اقامتِ دین کے یہی تین بنیادی اصول معلوم اور متعین ہوتے ہیں۔ اس لیے اس فرض کو ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان تینوں اصولوں پر پورے عزم و استقلال کے ساتھ عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اس عمل در آمد میں کوئی ایسی زمانی ترتیب ہے جس کی رو سے ضروری ہے کہ جب پہلے اصول پر پوری طرح عمل ہو لے تب دوسرے کی ابتداء کی جائے اور جب دوسرے اصول کی بھی پیروی کا حق ادا ہو جائے تب کہیں جا کر تیسرے کا نام لیا جائے۔ اس کے برعکس صحیح بات یہ ہے کہ ان تینوں اصولوں پر عمل بیک وقت شروع ہونا چاہیے۔ اور اگر اس عظیم مہم کے شروع کرنے سے پہلے کسی بات کی ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ذہن کی پوری یکسوئی اور دل کی سچی شہادت کے ساتھ انسان کا لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ پر ایمان ہو۔ اس یقین و اقرار کے بعد جب ایک شخص یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مخاطب کیے جانے والے گروہ میں داخل ہو گیا، تو قرآن ایک ہی ساتھ اس کے سامنے اپنے یہ تینوں اصول رکھ دیتا ہے، اور اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق ان پر عمل کرے۔

اس بات کی سب سے بڑی دلیل، کہ ان اصولوں پر عمل ایک ساتھ ہونا چاہیے، یہ ہے کہ ان میں عملی پیروی کے لحاظ سے تفریق کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ دوسرے اور تیسرے

اصول اپنی حقیقت کے اعتبار سے اپنی ایسی کوئی مستقل بالذات نوعیت رکھتے ہی نہیں کہ ان کے وجود میں پہلے اصول کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس کے بخلاف حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی اصل کی شاخیں ہیں، یا کم از کم یہ کہ اس کے راست تقاضوں میں شامل ہیں۔ اور انہیں اختیار کئے بغیر خود اس پر عمل کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح دوسرے اور تیسرے نکتوں پر عمل پیرا ہونا در اصل پہلے ہی نکتے کے اتباع کو مکمل کرنا ہے۔

اس دعوے کی صحت معلوم کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کسی بحث کی ضرورت نہیں کہ تقویٰ کے صحیح اور کامل عملی مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے جسے اوپر کی سطروں میں ابھی جلد ہی واضح کیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے سارے احکام کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا اور اس کی قائم کی ہوئی جملہ حدود کی پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ اس بات کو اگر ذہن میں پوری طرح مستحضر کر لیا جائے تو یہ حقیقت آپ سے آپ روشن دکھائی دینے لگے گی کہ اقامتِ دین کے آخری دو اصول فی الواقع پہلے ہی اصول کے اجزاء یا اس کے قریب ترین تقاضے ہیں، اور یہ اس لیے کہ اپنے نصب العین کی خاطر تمام اہل ایمان کا باہم متحد و منظم ہونا اور امر بالمعروف کو اپنی ایمانی زندگی کا شعار بنائے رکھنا بھی، کتاب و سنت کی رو سے، انہی احکام و حدود میں داخل ہے، جن کی پیروی اور پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ چنانچہ پہلے باہمی اتحاد کے بارے میں چند آیتوں کی شہادت سنیئے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبۃ:۱۱۹)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے مومنوں کے ساتھ رہو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الحجرات:۱۰)

اہل ایمان آپس میں بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان (اختلاف و عناد پیدا ہو جانے کی صورت میں) صلح کرا دو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، تاکہ اس کی رحمت سے سرفراز ہو سکو۔

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ. (الروم:۳۱۔۳۲)

اس کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو، یعنی ان لوگوں میں، جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے اور اب ہر گروہ اپنے اپنے خیالات و افکار میں مگن ہے۔

ان آیتوں میں سے پہلی آیت کے اندر سچے مومنوں سے جڑ کر رہنے کو، اور دوسری کے اندر دو باہم پھٹے ہوئے مومن دلوں کے دوبارہ جوڑ دینے کو "اتقا" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور تیسری آیت میں ایک طرف تو ملی انتشار کو شرک کا خلاصہ قرار دیا گیا ہے، گویا یہ کہا گیا ہے کہ ملی اتحاد توحید کا خاصہ ہے۔ دوسری طرف اس میں توحید کے ماننے والوں سے تقویٰ اور اقامتِ نماز کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں چیزوں میں سے ایک (تقویٰ) تو توحید کا باطن ہے اور دوسرا (نماز) اس کا ظاہر ہے۔ یہ سب باتیں اس امر پر صاف دلالت کرتی ہیں کہ ملی انتشار، تقویٰ اور نماز دونوں کی روح کے یکسر منافی ہے۔ جماعتی اتحاد اور تنظیم کی ضروری اور اہم ترین علامتوں میں سے ایک علامت ہے، اور اسکا موجود نہ ہونا صحیح تقویٰ کے نہ ہونے کا ثبوت ہے۔

اس کے بعد کچھ دوسرے نصوص ملاحظہ ہوں جن میں اسی طرح امر بالمعروف کو بھی صلاح و تقویٰ کا کام قرار دیا گیا۔

(۱) يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ (آل عمران:۔ ۱۱۴، ۱۱۵)

یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں، اور اچھے کاموں میں تیزگام رہتے ہیں۔ اور اللہ متقیوں سے واقف ہے۔

(۲) يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَّاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ. (التوبہ:۱۳۲)

اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب میں ہیں، اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔ یاد رکھو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

پہلی آیت میں مطلقاً ہر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو متقیوں کی صفات اور تقویٰ کے اعمال میں شمار کیا گیا ہے، اور دوسری میں نہی عن المنکر کی ایک خاص شکل، یعنی دین کے دشمنوں سے لڑنے کو تقویٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

اب ایک اور آیت سنیے، جو ان دونوں حقیقتوں کی جامع ہے:۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَّاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ:۷۱)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے "ولی" ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اس آیت نے ملی اتحاد اور امر بالمعروف، دونوں چیزوں کو ایمان کے اعمال اور مقتضیات کی حیثیت سے ایک ہی ساتھ جمع کر دیا ہے۔

ان تمام آیات کی روشنی میں اس وہم کی تاریکی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ جب تک اقامتِ دین کے پہلے نکتہ پر پورا پورا عمل نہ ہو لے اور انسان کا باطن نورِ تقویٰ سے اچھی طرح جگمگا نہ جائے اس وقت تک اس کے لیے دوسرے اور تیسرے نکتوں کی طرف توجہ کرنا صحیح نہیں، لیکن افسوس ہے کہ یہ خیال آج ایک واقعہ بن کر ہمارے بے شمار ذہنوں پر مسلط ہے اور اس نے دین کی خدمت و نصرت کے بارے میں ہمارے فکر و عمل کے زاویے بدل کر رکھ دیے ہیں۔ نصرتِ دین کی جو گاڑی تین پہیوں پر چلائی جانی چاہیے تھی، اور جو ان تین پہیوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ اسے صرف ایک پہیے سے چلانے کی عجیب و غریب کوشش ہو رہی ہے، جس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ نکل رہا ہے کہ یہ گاڑی ایک انچ بھی آگے بڑھنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑی زمین میں کچھ دھنستی ہی جا رہی ہے۔ دراصل یہ خیال ایک زبردست حجاب ہے، جو ہمارے اکثر نیکوکاروں کی بصیرتوں پر خاص طور پر پڑا ہوا ہے۔ اس کا ظاہری پہلو یقیناً بڑا دین دارانہ دکھائی دیتا ہے مگر حقیقتاً یہ نظریہ اسلامی طرز فکر سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں رکھتا۔ جب ایک شخص سچا متقی بن ہی اس وقت سکتا ہے جب وہ اہل ایمان گروہ سے مربوط بھی رہے اور اپنی سکت بھر امر بالمعروف کا فرض بھی انجام دیتا رہے، تو یہ کہنا کتنا بے معنی ہوگا کہ آدمی پہلے کامل اور معیاری متقی بن لے تب کہیں جا کر ملی اتحاد و تنظیم اور امر بالمعروف کی مہمات کا آغاز کرے۔ ان تینوں نکات کی مثال تو بالکل ایک درخت کے اجزا کی سی ہے جس طرح بیج سے جوں ہی ننھا سا پودا اگتا ہے اس میں جڑ، تنے اور پتے، سب کی تخلیق ہو جاتی ہے، اور یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ نمو پاتی اور پروان چڑھتی رہتی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بیج سے جڑ نکل کر خوب موٹی تازی ہو لیتی ہے تب اس میں سے تنہ نکلتا ہے اور جب تنہ اپنی پوری بالیدگی کی حد کو پہنچ جاتا ہے تب جا کر اس میں سے پتیاں نکلنی شروع ہوتی ہیں۔ اسی طرح قلب انسانی میں جب ایمان کا بیج جگہ پکڑتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس سے صرف تقویٰ کی جڑ ہی نکلتی ہو اور نکل کر ایک مدت دراز تک خوب موٹی تازی اور مضبوط ہوتی رہتی ہو۔ تب جا کر اتحاد ملی اور امر بالمعروف کا موقع آتا ہو، بل کہ ہوتا یہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ اس سے ملی اتحاد اور امر بالمعروف کی شاخیں اور پتیاں بھی نکلنے لگتی ہیں۔ پھر زمین کی زرخیزی اور بیج کی عمدگی کے مطابق تقویٰ کی جڑ جس قدر گہری اترتی جاتی ہے اسی قدر شاخیں اور پتیاں بھی بلند و بالا اور سرسبز و شاداب ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ کا منظر سامنے آجاتا ہے۔